فہرستِ مضامین

جلد ۲۷ — نمبر ۱

ہمایوں بابت ماہِ جنوری ۱۹۳۵ء

تصاویر

(۱) دیہاتی لڑکی (ہمہ رنگ)؛ (۲) سوستان کی ایک پہاڑی سڑک کا نظارہ (۳-۴) شملے کے دو منظر (۵) ٹوٹا ہوا برتن (۶) مغربی ایشیا کی ایک ادی (۷-۸) بچپن (۹) ژاں دارک میدانِ جنگ میں سو رہی ہے (۱۰) خیال (۱۱) ڈینٹے کا بچپن (۱۲) قدیم روس کی ایک دعوتِ عروسی (۱۳) گرمی۔

چندہ سالانہ مع سالگرہ نمبر ؏ ششماہی ؏ (مع محصول) قیمت فی پرچہ سالگرہ نمبر

تجلی

بجلی چمک کے چھپ گئی پھر کیوں سحاب میں؟ کیا کوئی دیدِ حسن کے لائق نہ تھا یہاں؟
کب تک چھپے گا چہرہ یہ آخر نقاب میں؟ لویک بیک پھر آپ کا جلوہ ہوا عیاں؟

حقّا کہ برقِ حسنِ حسیناں شنیدہ ایم
ایں نورِ شعلۂ رُخِ رخشاں ندیدہ ایم

بجلی نہیں تجلّیِ یزداں ہے ابر میں! اور یہ بھی محض عکس ہے اُس کے ظہور کا!
جلوہ اُسی کا ظاہر و پنہاں ہے ابر میں! صد برق ایک قطرہ ہے دریائے نور کا!

اے آفتاب ذرّۂ مہرِ ضیائے تو
گستاخی تمام خیالِ ثنائے تو

حضرتِ ہمایوں مرحوم

بزمِ ہمایوں

اگر پوچھا جائے کہ اردو کے موجودہ ادب کا مطالعہ کہاں کیا جا سکتا ہے تو غالباً صحیح جواب یہ ہوگا کہ جامعہ عثمانیہ میں یا اردو کے رسائل میں۔ باقاعدہ علمی مواد حیدرآباد سے دستیاب ہوگا اور بے قاعدہ علمی و ادبی ذخیرہ مختلف شہروں میں بکھرا ہوا نظر آئے گا بظاہر بے قاعدہ و بے ترتیب اور اسی لیے دلچسپ اور کم از کم عمر رسیدہ کم فرصت لوگوں کے لیے سبق آموز بھی۔ آج کل مغرب میں بھی ہر زبان کے علم ادب کا خاصا حصہ رسالوں یا رسالہ نما کتابوں میں پیش کیا جا رہا ہے اس کی دو وجوہ ہیں۔ اول تو یہ کہ زندگی کی گوناگوں مصروفیتوں میں لوگوں کو فرصت بہت کم ہوتی ہے اور وہ طول طویل کتابوں کے باقاعدہ مطالعہ کیلئے وقت نہیں پاتے۔ دوسرے چونکہ اب علوم و فنون کی معلومات کو ہر کہ و مہ تک پہنچانا مقصود ہے۔ لہٰذا یہ ضرورت لاحق ہو گئی ہے کہ انھیں ایسا لباس پہنایا جائے جو خاص و عام کے لئے دلچسپ و دلکش ہو۔ اس کا نتیجہ ہے کہ بڑے بڑے مضامین کو چھوٹی چھوٹی کتابوں کی صورت میں پیش کیا جائے۔ یا ایک ہی کتاب میں ایک علمی مسئلے کے مختلف موضوعات پر مختلف مصنفین سے مضامین لکھوائے جائیں تاکہ مضمون میں تنوع اور دلچسپی پیدا ہو۔ یا مضمون کو واضح اور آویزہ بنانے کے لیے جا بجا تصویریں اور خاکے زیب کتاب ہوں۔ اب علم و فن صرف چند خاموش طبع کتابی کیڑوں کا مشغلہ نہیں رہا بلکہ عام تعلیم و ترقی کی وجہ سے لاکھوں کروڑوں انسانوں میں مختلف قسم کی معلومات سے بہرہ اندوز ہونے کا شوق پیدا ہو گیا ہے ہمارے ملک میں یہ کام اخبارات و رسائل کے ذریعے سے سرانجام ہو رہا ہے۔ اگر کوئی اردو ادب کا طلب گار اپنی خلوت میں سنہ ۱۹۳۳ء کے اردو رسائل اپنے اردگرد پھیلا کر بیٹھ جائے اور ان کی ورق گردانی کرے اور چاہے کہ وہ افسانوں کے علاوہ دوسرے چند مفید و دلچسپ مضامین پر ایک سرسری نظر ڈالے تو غالباً اس کی نظر مفصلہ ذیل عنوانات پر بھی پڑے گی:۔

علمی و فنی اور فلسفیانہ مضامین میں تجزیۃ النفس حیاتیات اور طب میں جدید رجحانات طبیعی مظاہر کا ایک نیا نظریہ صورتوں اور مزاجوں میں فرق تعبیر خواب (رسالہ سائنس) مغلوں کا فن مصوری حیات انسانی کا اساسی تضاد (جامعہ) انسان کی لا زوال عظمت۔ زندگی کی عجیب و غریب داستان (نگار) نظریۂ اضافیت (ہندوستانی) زندہ فلسفے نیند (ہمایوں) معاصرانہ تحریکات کے مضامین میں جمعیۃ الشبان المسلمین (جامعہ) ملاحظات تمہارا مسلک اور میرا۔ دنیائے اسلام کا عظیم انقلاب۔ موجودہ ترقی دھوکا ہے (نگار) موجودہ کساد بازاری کے اسباب (ہندوستانی) مغرب کی خوفناک غلطی اور اس کا ازالہ (معارف) روس میں جہالت کا دیوالہ۔ شادی اور محبت (ہمایوں)، ملکی مضامین میں ہند میں وفاقی حکومت (جامعہ) دیہات کی اصلاح و بہبود کا کام (زمانہ) اردو، ہندی، ہندوستانی (ہندوستانی) ہندوستانی گھر کی تعمیر جدید (ادبی دنیا) ایک مغل شاہزادے کی تعلیم (نیرنگ خیال)، ادبی و تنقیدی مضامین میں اردو شاعری کا مطالعہ۔ سودا۔ روسی ناول۔ مضامین ٹیگور (اردو) اودھ پنچ

کا پہلا دہریہ (جامعہ)، عہدِ حاضر کے افسانہ نگار، ترجمہ کی چند اصولی باتیں (نگار)، ہندی ادب میں مسلم مصنفین۔ اردو کے ہندو ادیب (زمانہ) تذکیر و تانیث۔ اردو کے افسانوں میں عورت۔ افسانوں کے ترجمے (ادبی دنیا) کبیر کے دوہے۔ اردو ڈراما، حسن کاری و افسانہ نویسی، اردو ادب اور ابوالکلام آزاد (ہمایوں)۔ یہاں گنجائش نہیں کہ ہم ان مفید و دلچسپ مضامین پر تنقیدی نظر ڈالیں۔ قارئین میں سے جن کی نظر سے یہ مضامین نہ گزرے ہوں وہ ان رسالوں کے سال گزشتہ کے پرچے قیمتاً طلب کریں۔ محض بیچارے دوستوں سے عاریتاً نہ مانگیں، اور لطف اندوز ہوں۔

موجودہ اردو ادب کو کس قسم کے خیالات کی حاجت ہے؟ ہماری رائے یہ ہے کہ ہر چند تنقید کی موجودگی ایک ترقی یافتہ ادب کی نشانی ہے اور ہر چند اہلِ ادب کو ضرورت ہے کہ وہ اردو ادب میں کھرے کھوٹے کی پہچان کرنا سیکھیں اور سکھلائیں یعنی تنقیدی مضامین لکھیں اور لکھوائیں لیکن ماسوا اردو کے دیگر رسائل کے ادبی مضامین کا بیشتر حصہ محض زبان و ادب یا خیالی و تفریحی مضامین کے لئے وقف نہ ہونا چاہیئے۔ زبان خیالات کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنے زمانے کے اہم ترین خیالات کو اپنی زبان میں ادا کرنا اور پیش کرنا ہے۔ ہمارے زمانے کے یہ اہم خیالات حکمت کے نظریوں اور تمدن کے رجحانات سے متعلق ہیں۔ لہٰذا اردو رسائل کو محض زبان و بیان کا اجارہ دار نہ ہونا چاہیئے بلکہ انہیں ملک و قوم کے لئے موجودہ تحریکات اور تازہ ترین افکار و نظریات کی نشر و اشاعت کا آلۂ کار بننا بھی لازم ہے۔ اس سریع السیر زمانے میں ہمیں نہ محض اپنی زبان کی خدمت کرنی ہے بلکہ اپنے قومی و ملکی بھائیوں کی تعلیم و ترقی کا سامان بہم پہنچانا ہے۔ ہم کہاں ہیں اور دنیا کہاں سے کہاں نکل گئی! کہیں محکوم آزاد ہو گئے کہیں مزدور حاکم بن گئے کہیں عورتیں مردوں کے برابر آ بیٹھیں کہیں نوجوان بڑھوں اور بڑھوں پر خندہ زن ہوئے۔ جمہوریت متزلزل ہوئی۔ اشتراکیت اٹھی تھی کہ اشتمالیت پھلانگ کر اس سے بھی کوسوں آگے بڑھ گئی۔ معیشت نئے سانچے میں ڈھل رہی ہے۔ نفس شعور اور تحت الشعور میں منقسم ہو رہا ہے اور آزادی صرف سیاست میں نہیں بلکہ معیشت میں، مذہب میں، فن میں، تقریر میں، تحریر میں، خیال میں، کہیں کیا کیا گل کھلا رہی ہے۔ اور آگاہی غافل دلوں میں بھی خود بخود بزور نفوذ کر رہی ہے۔ اس حال میں کیا ہمارے علماء و ادبا کا سب سے پہلا فرض نہیں کہ وہ اپنے ہم وطنوں کو ان جدتوں سے آگاہ کریں تاکہ ان میں سے جو ہمارے لیے حیات افزا ہوں ان کا ہم بلا تامل خیر مقدم کریں اور جو حیات کش ہوں اُن سے بچنے کے لیے خودداری و سلامتی کا رویہ اختیار کر لیں۔ ہم اپنے معزز اہلِ قلم کو اس اہم بات کی طرف خاص طور پر متوجہ ہونے کی درخواست کرتے ہیں۔

آخر میں ہم مفصلۂ ذیل اہلِ قلم کا دلی شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے گزشتہ سال ہمایوں کو اپنے خیالات سے مستفید کیا۔

نثر میں حضرات فلک پیما، فیاض محمود، ادیب، ممتاز حسن، فہیم بیگ، عطاء الرحمٰن، محشر، سعادت حسن، جمیل واسطی، منصور احمد، وقار عظیم، شہاب، تمنائی، مہدی علی خاں، ڈاکٹر حمید، رنا، آرزو جلیلی، راہرو، محمد حسن خاں، محمود مورخ، ح ب صاحبہ، غلام السیدین، مقبول، تقی علی ہاشمی، محمد صدیق تاونی، یعقوب الرحمٰن عثمانی، حسن عزیز، جاوید، جیواد، ماہر القادری، عبدالقادر جیلانی، ناظم، محمد اسلم خاں، دیوانہ وغیرہ۔

نظم میں حضرات جوش، مقبول، عدم، اختر، آزاد، وقار، امجد، اصغر، ساغر، رتس، ذوقی، حفیظ ہوشیارپوری، نشتر، صدق جائسی، ندیم، ریاض احسن، قیس، غازی، شرما، وحشت، ناشاد، ماہر، فراق، علی منظور۔

بشیر احمد

تصحیح: ہمیں افسوس ہے کہ دسمبر ۱۹۳۴ء کے ہمایوں میں "نازی جرمنی" کے متعلق مضمون غلط طور پر ڈاکٹر صغیر احمد صدیقی سے منسوب ہو گیا۔ یہ مضمون ڈاکٹر محمد صدیق تاونی کا لکھا تھا۔

جہاں نما

گزشتہ پانچ سالوں میں ہر پچھلا سال پہلے سالوں سے زیادہ یاس خیز ثابت ہوا ہے۔ پانچ سال ہوئے کہ متمدن دنیا کی معاشی حالت یک لخت بگڑتی معلوم ہوئی۔ رسد زیادہ ہوئی طلب کم، قیمتیں گھٹیں، خسارے بڑھے۔ بنک کچھ بند ہوئے کچھ ٹوٹے۔ ہر ملک میں لاکھوں مزدور بیروزگار ہو گئے، سینکڑوں کروڑپتی دیوالیے ہوئے، حکومتوں نے اپنی حدود پر محصولی دیواریں کھڑی کر دیں اور معاشی خوش حالی کے لئے قسم قسم کی تدبیریں سوچیں لیکن تقریباً سب ناکام رہیں۔ دو سال سے ایک دل خوش کن وہم پیدا ہوا تھا کہ شاید معاشی حالت بہتری کی طرف مائل ہونے والی ہے کہ معًا سیاسی حالت کی روز افزوں ابتری اپنی بھیانک صورت دکھانے لگی۔ ۱۹۳۳ء کے متعلق شکایت تھی کہ دنیا کی معاشی کانفرنس اور تخفیف اسلحہ کی کانفرنس کامیاب نہ ہوئیں اور مانچوریا کے متعلق جاپان نے انجمن اقوام کی متفقہ آواز پر کان نہ دھرا۔ جرمنی اور فرانس آپس میں روٹھے رہے اور صلح و سلامتی خطرے میں پڑی رہی لیکن ۱۹۳۴ء کا سال اس سے بدرجہا بدتر نکلا اور بہت سے ایسے واقعات پیش آئے جن سے کبھی شبہ اور اکثر یقین ہو گیا کہ متمدن دنیا عنقریب پھر ایک خوفناک عالمگیر جنگ میں مبتلا ہونے والی ہے ایسی جنگ جو غالباً ایک لمبے عرصہ کے لئے اسے تباہ و برباد کر دیگی۔ دنیا اب تک اس جنگ سے محفوظ رہی ہے لیکن یہ سلامتی ہلاکت سے کچھ کم حیات کش نہیں کیونکہ یہ فقط اس شخص کی سی سلامتی ہے جسے موت کا حکم سنایا جا چکا ہو لیکن جس کی موت کا دن معین نہ کیا گیا ہو۔ اتحادوں کے جوڑ توڑ، مقابلے اور منافستے، مطلق مختاروں کی زبردستی، سامانِ جنگ میں اضافے، سیاسی رہنماؤں کی ناعاقبت اندیشیاں، کاروباری غرض پرستیاں، جیسا کہ مشہور ماہر سیاست سر فلپ گبز جس نے ۱۹۳۴ء کے موسم بہار و گرما میں یورپ کی سیر و سیاحت سے اس کی تازہ ترین حالت کا اندازہ کیا ہے رقم طراز ہے یہی وہ خوفناک عناصر ہیں جن سے مہذب دنیا ہر لحظہ خطرے میں ہے۔ گو یہ بھی واقعہ ہے کہ جہاں کہیں بھی جاؤ عوام الناس ہر طرح کی جنگ کے شدید مخالف اور صلح و امن کے زبردست مؤید نظر آتے ہیں لیکن ان کی دلی خواہشات کس کام آئیں گی اگر ان کے شقی القلب رہنما انھیں ڈھوروں کی طرح لڑائی کے میدان میں دھکیل دیں گے کہ یا ہمنوا ہم جنسوں پر گولی چلاؤ یا خود اُن کی گولیوں کا نشانہ بن جاؤ۔

انگلستان بمقابلہ اور ملکوں کے ۱۹۳۴ء میں سب سے زیادہ امن پسند بنا رہا کچھ اس وجہ سے کہ وہاں کی معاشی حالت اب پہلے سے بہتر ہو رہی ہے اور کچھ اس لیئے کہ سیاسی نقطۂ نظر سے بھی امن پسندی اور حال پر قناعت مدت سے انگلستان کا مطمح نظر بنی رہی ہے کیونکہ اس کی پھیلی ہوئی سلطنت کے لیئے اب اور پھیلنے کی گنجائش کم اور سمٹنے اور ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کا اندیشہ زیادہ ہے۔ تخفیف اسلحہ کی کانفرنس کے انگریز صدر ہنڈرسن نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ کسی طرح یہ کانفرنس ناکام نہ رہے اور روٹھا ہوا جرمنی پھر واپس آجائے مگر نہ ہو سکا۔ اسی طرح انگریز سیاست دان ایڈن پیرس

سے۔ روما اور روما سے برلن کا چکر لگاتا رہا کہ کسی طرح فرانس اور اطالیہ اور جرمنی میں مفاہمت پیدا ہو لیکن سیاسی حالت جوں کی توں رہی۔ آخر انگلستان کی حکومت نے اپنی ہوائی طاقت کو بڑھانے کا یہ کہہ کر اعلان کر دیا کہ یہ ناممکن ہے کہ باقی ساری دنیا روز بروز زیادہ مسلح ہوتی جائے اور صرف انگلستان تخفیف پر مصر رہے۔ انگریز اسلحہ ساز کارخانہ داروں نے اس تجویز کی تائید کی۔ دو اور واقعات قابلِ غور ہیں۔ برطانیہ کی مزدور جماعت نے مقامی مجالسِ اضلاع کے انتخابات میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی جس سے مستقبل کے متعلق اس کی امیدیں روشن ہوئیں اور دارالعوام میں ہندوستان کو نام نہاد خود اختیاری حکومت دیئے جانے کے متعلق کمیٹی کی رپورٹ شائع ہوئی جس سے قدامت پسند انگلستان میں اطمینان اور ہندوستان میں شورش پیدا ہو گئی۔

فرانس میں جیسا کہ ہوتا رہا ہے نئی وزارتوں کا شور وغل برپا رہا ایک حکومت مٹی ایک ابھری۔ بین الاقوامی حلقے میں فرانس بدستور اپنی سلامتی پر زور دیتا رہا۔ کہا گیا کہ جرمنی کے ہاں چالیس پچاس لاکھ فوج تیار ہو رہی ہے اور اس کی نیت صاف نہیں۔ ادھر اطالیہ سے بھی تعلقات بہتر نہ ہوئے۔

اطالیہ کی آبادی بڑھ رہی ہے لیکن اس کی سلطنت چھوٹی ہے۔ اس کے برعکس فرانس کی آبادی میں مقابلۃً کمی ہے۔ گو اس کی سلطنت وسیع ہے۔ فرانس چاہتا ہے کہ فالتو اطالویوں کو فرانسیسی بنا لے مگر اطالیہ اپنی قومیت پر مصر ہے۔ بحیرۂ روم میں بھی دونوں میں مسابقت ہے۔ جنگِ عظیم میں اطالیہ نے باوجود ظاہری کامیابی کے اپنی کمزوری کو محسوس کیا اور جان لیا کہ یورپ کی سیاسی محفل میں اسے وہ زور و سطوت حاصل نہیں جو بعض اور دولتوں کو حاصل ہے۔ اس کے بعد مسولینی نے آ کر اس کے سامنے اتحاد و قوت کا ایک نیا فاشی نصب العین پیش کیا اور اسے بڑی بڑی طاقتوں کے مقابلے کے لیئے تیار کر دیا۔ اسی لیئے براعظم پر اگر فرانس یگوسلاویا کا حامی ہے تو اطالیہ ہنگری اور آسٹریا کی پشت پناہ ہے اگر فرانس جرمنی کا دشمن ہے تو اطالیہ اس کا دوست بننے کو تیار ہے۔ مسولینی اطالیہ کو حقیقی معنوں میں ایک دولتِ عظمیٰ بنانے کے درپے ہے۔ ایک تو قومی تنظیم کے ذریعے سے اور دوسرے بین الاقوامی اکھاڑے میں سیاسی داؤ پیچ کے طریقے سے۔ اس کام میں وہ بھی دوسرے مطلق مختاروں کی طرح مقررہ مسلمہ اصولوں سے بے نیاز ہے اور اپنا مقصد حاصل کرنے میں ہر طرح کے ذرائع اختیار کرنے کو ہر وقت تیار رہتا ہے۔ حال میں اس نے اطالیہ کے سیاسی دستور کی موقوفی کا اعلان کیا اور ملک میں بائیس "شخصیئے" مرتب کر کے ماہرین کے ذریعے سے ملکی نظم و نسق کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔ ماہِ اگست میں اس نے اپنی ایک تقریر میں اطالیہ کو آنے والی جنگ کے لیئے ہمہ تن تیار ہو جانے کی ہدایت کی جس کا مدعا اپنے ہم قوموں کو ابھارنے سے زیادہ دنیا کو ڈرانا دھمکانا تھا۔

جرمنی کو آج کل مغرب کے قبیلے کا ایک ضدی ہٹیلا نوجوان سمجھا جاتا ہے۔ بالخصوص فرانس اور انگلستان میں لوگ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ یورپ کی اکثر موجودہ مشکلات کا موجب جرمنی ہی کا رویہ ہے۔ فروری میں دس لاکھ نازیوں نے ہٹلر سے وفاداری کا حلف اٹھایا۔ جولائی میں ہٹلر نے ایک خفیہ سازش کا سراغ پا کر اپنے سینکڑوں مخالفین و موافقین کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اگست میں ہنڈن برگ مر گیا اور چالیس لاکھ

جرمنوں کے سوا باقی تمام قوم نے ہٹلر کے حق میں رائے دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہٹلر صدر جمہوریہ اور سپہ سالار واحد قومی رہنما سب کچھ بن کر جرمنی کا مختار مطلق ہوگیا۔ جنگِ عظیم کے بعد پندرہ سال تک جرمن اتحادیوں کی فوجی قوت اور تاوانِ جنگ کی شدت کے نیچے دبتے چلے گئے حتیٰ کہ ہٹلر کی نازیت نے آکر ان کو اس مصیبت سے چھڑایا۔ اور ان میں ایک نئی روح پھونک دی۔ اس نے کہا کہ جرمنی جنگِ عظیم کا ذمہ دار نہ تھا اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ جرمنی کو فوجی طاقت کے معاملے میں دوسروں کے ساتھ برابری کا درجہ حاصل نہ ہو۔ اس نے ساری جرمن قوم میں اعتماد نفس اور خودداری کی ایک رو دوڑادی جرمن پھر جرمن بنے۔ وہ پولستان سے غصب شدہ ڈین زگ کا شہر اور فرانس سے غصب شدہ سار کا علاقہ واپس لینے پر مصر ہوئے اور تمام جرمنوں کو ایک ہی جھنڈے کے نیچے جمع کرسکنے کے لئے آسٹریا کو جرمنی میں شامل کرلینے کے خواہاں بھی نظر آئے۔ آسٹریا کی علیحدگی پسند جماعت نے ان سے روگردانی کی جس پر آسٹریا کے نازیوں نے جوش میں آکر اپنے صدر جمہوریہ ڈاکٹر ڈالفس کو جولائی میں قتل کردیا۔ یورپ میں ایک سنسنی پھیل گئی جنگ کی گفتگو ہونے لگی۔ فرانس نے کہا ہم نہ کہتے تھے، انگلستان نے بھی برا مانا۔ اطالیہ بھی ناراض ہوا۔ اور نومبر میں آسٹریا ہنگری اور اطالیہ کے درمیان ایک خفیہ سمجھوتا ہوگیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایک مطلق العنان اپنے مقاصد کے حصول میں اپنے خیالات کے سوا عام اصولوں کے ٹھکرادینے میں ذرا پس و پیش نہیں کرتا۔ جمہوریت کی روح جرمنی میں نیم مردہ بلکہ شاید مردہ ہی ہوچکی ہے۔ یہودیوں کے ساتھ وحشیانہ ناروا داری کا سلوک کیا گیا ہے۔ عورتوں کی آزادی ایک حد تک چھن گئی ہے۔ جرمنی اپنا قرضہ ادا کرنے میں لیت و لعل کررہا ہے لیکن ادھر دیکھو کہ باوجود جرمنی کی انتہائی کوششوں کے اس کی مالی حالت خراب سے خراب تر ہورہی ہے۔ اس لئے وہ ادائے قرض میں کیونکر التوا کی درخواست نہ کرے اور اسی لئے وہ اپنی نوآبادیات کی واپسی کا مطالبہ کرنے پر بھی مجبور رہے۔ بلکہ مذہبی آدمی یہ سن کر خوش ہوں گے کہ جرمنی میں پھر لوگ جوق در جوق گرجاؤں میں جانے لگے ہیں اور صلح پسندوں کو یہ جان کر مطمئن ہونا چاہیئے کہ کئی انصاف پسند اجنبی جرمنی کے عوام کو بلکہ خود ہٹلر کو بھی فرانس سے مفاہمت کرنے کا خواہشمند پاتے ہیں اور نسائیت کے حامیوں کو سٹٹگارٹ کا وہ منظر نہ بھولنا چاہیئے جہاں جسمانی طاقت کے ایک مظاہرے میں اسی ہزار جرمن عورتوں نے حصہ لے کر نازی جرمنی میں اپنی خودداری اور روز افزوں اہمیت کا زندہ ثبوت پیش کیا۔ حق یہ ہے کہ جرمن قوم خواہ مخواہ لڑائی چھیڑنا نہیں چاہتی۔ گو اس میں شک نہیں کہ اس کے نوجوان اپنے انسانی و قومی حقوق پر اصرار کررہے ہیں اور قوموں کی انجمن میں ان ہم جنسوں کے برابر بیٹھنے کے خواہاں ہیں جن سے تھوڑی مدت ہوئی ان کے بزرگ برسرپیکار رہے۔

روس کا انجمن اقوام کا رکن بن جانا گزشتہ سال کا ایک اہم ترین واقعہ ہے۔ سوویٹ کی سولہ سالہ تاریخ اس کے اشتمالی رہنماؤں کی تندمزاجی و دوراندیشی کی داستان ہے ۱۹۲۱ء تک۔ روس خانہ جنگی اور خوں ریزی میں منہمک رہا اور ملک میں سوویٹ کا دستور رائج ہوا ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۸ء تک ماسکو کی مساعی اس بات پر وقف رہیں کہ خارجی دنیا اس کی انقلابی حکومت کو تسلیم کرے اسی دوران میں اشتمالیت کی داخلی پالیسی گرم سے نرم ہوتی گئی تاکہ یوں کاشتکاروں کی کچھ دل جوئی ہوسکے۔ ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۲ء تک پہلے پنج سالہ لائحہ عمل کی تکمیل ہوئی اور توقع سے جلد تر ہوئی پھر دوسرے پنج سالہ لائحہ عمل کا آغاز ہوا جس کا مقصد اشیاء کی پیدائش میں اضافہ اور ان کی قیمتوں میں کمی تھا۔

اس کے ساتھ ہی سوویٹ نے غیر یعنی سرمایہ دار ملکوں کی طرف دوستی اور یگانگت اور اشتراکِ عمل کا ہاتھ بڑھایا۔ کیونکہ اس کی دوربیں نگاہوں نے صاف دیکھ لیا کہ دنیا کو راہ پر لانے کا کام اس قدر دشوار ہے کہ اس کے سرانجام دینے میں خود سوویٹ کے الٹ جانے کا کھٹکا ہے۔ اس لئے مصلحت اسی میں ہے کہ پہلے صرف اپنے گھر کے سنبھالنے کا کام ذمے لیا جائے اور آئندہ کے منصوبوں کو فی الحال آئندہ پر چھوڑ دیا جائے چنانچہ روس نے ہر طرف صلح و آشتی کے پیغام بھیجے اور دوسری قوموں کے ساتھ کم از کم چودہ معاہدے مکمل کر لئے۔ روس کے متعلق رائیں اتنی ہی مختلف ہیں جتنے رائیں دینے والے بلکہ تعجب تو اس پر ہے کہ جتنے لوگ وہاں سے لوٹ کر آتے ہیں چار دوست بھی مل کر وہاں جاتے ہیں تو آ کر ہر ایک اپنی اپنی الگ کہانی سناتا ہے۔ اس کی صریح وجہ یہ ہے کہ ہر شخص روس کے نئے تجربوں کو عموماً اپنے ہی نقطۂ نگاہ سے دیکھتا اور محسوس کرتا ہے۔ وہاں اتنی بری اچھی چیزیں پہلو بہ پہلو نظر آتی ہیں کہ جو شخص قباحتوں کو دیکھتا ہے وہ سوویٹ کو بہت برا۔ اور جو اس کی خوبیوں کو دیکھتا ہے وہ اسے بہت اچھا سمجھنے لگتا ہے۔ روس میں کیا ہوا؟ ایک عظیم الشان پرانی عمارت کو منہدم کیا گیا۔ اس کے ٹوٹے پھوٹے آثار ابھی وہاں ادھر ادھر بکھرے پڑے ہیں۔ اور بیچ ہی میں ایک عظیم الشان نئی عمارت بھی تعمیر ہو رہی ہے کہیں ابھی اس کی بھدی سی بنیادیں ہیں کہیں اس کی سر بفلک دیواریں بن رہی ہیں۔ اس کراہ اور چیخ پکار اور اس ہائے وائے اور واہ واہ کو جو سنتا ہے اس پر اس کا جدا جدا اثر ہوتا ہے ذرا تھوڑی دیر کے لئے اپنے آپ کو روس کا ایک باشندہ تصور کرو۔ تمھاری تھوڑی یا بہت جائداد ہو باپ۔ دادا کی کمائی یا اپنے ہی پسینے کی۔ اور اس پر آ کر کوئی قبضہ جما لے اور تمھیں مار پیٹ کر نکال دے پھر تمھارا پیچھا کرے تمھیں اور تمھارے بال بچوں کو پکڑے اور ان کا اور تمھارا گلا گھونٹے اور یوں کسی کو مار ڈالے اور کسی کو طرح طرح کے عذابوں میں مبتلا کر دے تم میں کوئی قسمت والا بھاگ نکلے لیکن اکثر سسک سسک کر جان دے دیں کہو پھر تمھارا دل کیا کہے۔ کہو پھر تم اشتمالیت کی تعریف کے لئے کسی معاشیات داں کے پاس جاؤ گے؟ یا خیال کرو کہ تم ایک چیتھڑا پوش مزدور ہو تمھیں دو وقت کی روٹی بھی میسر نہیں تمھارے بچے فاقوں مرتے ہیں۔ ان کے اور تمھارے رہنے کو ایک زندان نما اندھیری کوٹھری ہے اور سونے کو ایک اٹواٹی کھٹواٹی۔ اور کوئی یکلخت آ کر تمھیں اس قفس سے کھینچ نکالے۔ اور تمھیں اور تمھارے بیوی بچوں کو ایک کھلے روشن مکان میں لے جا کر آباد کر دے۔ تم دن میں بجائے سولہ اور اٹھارہ گھنٹے کام کرنے کے صرف ۶، ۷ گھنٹے کام کرو۔ ہر چوتھے پانچویں حکومت تمھارے لئے تھیٹر اور سینما فراہم کرے۔ تمھاری بیوی کارخانہ یا کھیتوں میں کام کرے تو تمھارے ننھے کے لئے ایک سرکاری ماما موجود ہو۔ بلکہ جب تم اور وہ سرکاری باغ کی سیر کو جاؤ تو وہاں پہنچتے ہی ایک سرکاری کھلائی تمھارے بچے کی نگہداشت کو فوراً حاضر ہو جائے تمھاری زندگی کا حکومت خود بیمہ کرائے تمھیں پوری اجرت پر چھٹیاں ملا کریں۔ تم رذیل اور ان پڑھ سے پڑھے لکھے اور شریف بن جاؤ اور پھر تم سے کہا جائے کہ تم ہی دنیا کی واحد امید ہو تو کہو تمھیں زندگی کتنی شاندار معلوم ہو؟ تم پھر "اگر فردوس بر روئے زمین است" وغیرہ وغیرہ نہ کہہ اٹھو؟

اس لئے یہ کہنا سخت دشوار ہے کہ روس اچھی جگہ ہے یا بری۔ سوویٹ کی حکومت ملعون ہے یا متبرک حقیقت یہ ہے کہ صرف مستقبل ہی فیصلہ کر سکے گا کہ اشتمالیت کی موجودہ برائیاں اور خوبیاں کہاں تک بری اور اچھی اور نتیجہ خیز ہیں۔ تاہم اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ سوویٹ

نے بعض شعبوں میں حیرت انگیز ترقی کی ہے اور ملک کو اور کا اور بنا دیا ہے۔ ۱۹۲۸ء میں مشترکہ کاشت گاہیں (FARMS) ۲ء۱ فیصدی
تھیں ۱۹۳۲ء میں ان کی تعداد ۸۰ فی صدی ہوگئی۔ اخبارات کی تعداد سوویٹ کے عہدِ حکومت ۸۶۷ سے ۵۴۰۰ اور ان کی اشاعت
بیس لاکھ سے تین کروڑ اسی لاکھ ہوگئی ہے۔ ۱۹۱۱ء میں پبلک کتب خانوں میں کتابوں کی تعداد نوے لاکھ تھی ۱۹۳۴ء میں یہ ۲ کروڑ چالیس
لاکھ کو پہنچ گئی اور قارئین کی تعداد جو ۱۹۲۶ء میں صرف بارہ لاکھ تھی ۱۹۳۲ء میں ایک کروڑ پندرہ لاکھ ہوگئی۔ روس میں خواندہ اشخاص کی نسبت
۱۸۹۷ء میں ۵ء۲۸ فی صدی تھی ۱۹۳۱ء میں یہ ۷ء۳۰ ہوگئی بلکہ کہا جاتا ہے کہ اس وقت روس میں صرف ۱۰ فی صدی ناخواندہ لوگ ہیں
۱۹۲۱-۲۲ء میں خواندہ اشخاص کی مجموعی تعداد چار لاکھ ۵۶ ہزار تھی ۱۹۳۱-۳۲ء میں یہ بڑھ کر ایک کروڑ ۳۶ لاکھ ۳۱ ہزار ہوگئی۔ اور مفت اور جبری
تعلیم کی مدت جو پہلے چار سال تھی۔ اب سات سال کر دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ سوویٹ نے ایک ہزار صنعت گاہوں کی بنیاد ڈالی ہے اور
تیس لاکھ فاحشہ عورتوں کو حکومت نے ترغیب دے کر کارخانوں میں شریفوں کا سا کام کرنا سکھایا ہے اور ان کی باقی ماندہ [illegible]
کے لیے خاص ادارے کھول دیئے ہیں۔ اُدھر سوویٹ کے جوشیلے رہنماؤں نے اپنے پہلے پنج سالہ لائحۂ عمل کے تجربے سے ماہرین اور علما و فضلا
کی اہمیت کو محسوس کرنا شروع کیا ہے۔ چنانچہ نومبر ۱۹۳۳ء کے آخر میں فیصلہ کیا گیا کہ روس میں روئی کے کارخانوں کے قیام و استحکام کے لیے
روسی ماہرین کی ایک جماعت انگلستان اور جرمنی اور امریکہ کو روانہ کی جائے جو وہاں سے آکر اس بیش بہا صنعت کے علمی و عملی پہلوؤں پر نظر ڈالے
اور اپنا مشورہ پیش کرے۔ اور گو کاشتکاروں کو روز و شب مشترک کاشت گاہوں میں داخل ہونے کی ہر طرح ترغیب دی جاتی ہے لیکن وہاں ان
کے لیے قسم قسم کے آرام و آسائش اور سامانِ شائستگی فراہم کیا جاتا ہے اور لینن کے اس زریں اصول پر احتیاط سے عمل ہو۔ چاہیے کہ اشتمالیت کی
رفتارِ ترقی قدم بہ قدم بلکہ انچ بہ انچ ہونی چاہیئے۔ حال میں ایک یورپی پروفیسر مسٹر سپیئر نے لاہور میں ایک اعلیٰ انگریز افسر کی صدارت میں روس
کی حالت پر ایک مؤثر تقریر کی جس میں اس نے کہا کہ روس میں اظہارِ خیال کی آزادی نہیں کیونکہ روسیوں کا خیال ہے کہ خیال کو جبر
شکنجے میں دبا سکتے ہیں۔ ان کے نزدیک نوعِ انسان کی بہتری معاشرہ کی بہتری میں مضمر ہے۔ اسی لیے وہ معاشرہ کے آگے فرد کی
سمجھتے۔ ۱۹۱۷ء کے انقلاب سے پہلے روس کی مجموعی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ انقلاب کے بعد امرا تو مفقود ہو گئے، متوسط طبقہ کچھ تباہ ہوا، باقی
طبقے میں مل گیا۔ مزدور جو اس سے قبل محض ایک ذلت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اب پہلی بار آسائش اور خود داری سے روشناس
صحیح معنوں میں زندہ ہو گئے ہیں۔ علاوہ سیاسی کام کے ان کا فالتو وقت شبانی انجمنوں، موسیقی کے جلسوں، تصویر گاہوں، عجائب خانوں
پبلک کھیلوں میں حصہ لینے میں گزرتا ہے۔ مزدور اب محض ایک تماشائی نہیں رہا بلکہ وہ ملک کے سٹیج پر سب سے نمایاں ایکٹر کی حیثیت سے کام کرتا
ہے اور ایک نئی دنیا وضع کر رہا ہے۔ کسان گو اتنے فائدے میں نہیں تاہم ان کی حالت بھی یقیناً پہلے سے بہتر ہے۔ علم کی روشنی سے
میں ایک خوشگوار تبدیلی واقع ہو رہی ہے لیکن سب سے زیادہ دل خوش کن اور حیرت انگیز تغیر عورتوں کی حالت میں رونما ہوا ہے۔ اشتمالیت نے عورت
اس کی صدیوں کی غلامی سے رہا کر دیا ہے جو اس کے سر پر تین بار تھے۔ باورچی خانہ، بچے اور مرد۔ اب روس کے شہروں میں اشتمالی باورچی

ہیں۔ کارخانوں اور کھیتوں میں بچوں کی نگہداشت کا انتظام ہے اور اپنی کمائی آپ کر سکنے کے باعث عورت مرد کی حکومت سے آزاد ہو چکی ہے اب شادی کی بنا نہ مذہب پر ہے نہ کسی عدالتی معاہدے پر۔ طرفین صرف ایک یادداشت پر خود ہی دستخط کر لیتے ہیں اور محکمۂ متعلقہ کو اطلاع دے دیتے ہیں۔ ابھی کہا نہیں جا سکتا کہ یہی شادیاں کہاں تک کامیاب رہیں گی۔ یہ صرف تجربے سے ظاہر ہوگا۔ روسی پادریوں کی حالت ابتر ہو رہی ہے لیکن مذہب کے معاملے میں اب نارواداری مطلق نہیں رہی۔ گو اشتمالی خیال کے آدمی بدستور لامذہب ہیں علماء ادبا کی جماعت تخلیقی کام میں مصروف ہے۔ روسیوں کے پیش نظر ایک عظیم الشان مشترک مطمح نظر ہے جو انھیں ہر روز آگے کو بڑھائے چلا جاتا ہے۔ اور انھیں یقین ہے کہ وہ ایک نئی دنیا کی طرح ڈال رہے ہیں اور ان کی مساعی کے باعث نوع انسان کا مستقبل شاندار ہو جانے والا ہے۔ اور گو یہ کہا جا سکتا ہے کہ بغیر کسی قسم کی روحانیت کے اشتمالیت کا پودا پروان نہ چڑھے گا لیکن اس حقیقت کو کوئی دوست۔ دشمن نظر انداز نہیں کر سکتا کہ باوجود انتہائی مشکلات اور شدید مخالفت کے روس کو اپنے نئے تجربے میں حیرت انگیز کامیابی حاصل ہو رہی ہے۔

ممالک متحدہ (امریکہ) کے نئے جمہوری صدر نے اپنے معاشی نظم و ترتیب کے تجربوں سے امریکہ میں ایک عظیم تغیر پیدا کر دیا ہے اس نے ماہرین کی ایک جماعت بنا کر گویا دماغوں کی ایک شراکت قائم کی ہے۔ جو معاشی و اجتماعی گتھیوں کو سلجھاتی اور مستقبل کی ایک نئی راہ دکھانے میں ممد و معاون ہو رہی ہے۔ ہر صنعت کے لیے ایک ضابطہ قرار دیا گیا ہے۔ مزدوروں کے لیے روزانہ کام کی مدت اور کم از کم اجرت معین کر دی گئی ہے۔ مزدور جماعت کا مجموعی طور پر گفت و شنید کرنے کا حق تسلیم کیا گیا ہے۔ حکومت بھوکے بے روزگاروں کی مدد کرتی ہے۔ اور بے کاری کی لعنت کو دور کرنے کے لیے نظارت نافعہ کے کئی کام شروع کر دیئے گئے ہیں کسانوں کے فائدے کے لئے گیہوں اور روئی کی پیداوار پر بندشیں عائد کی گئی ہیں۔ اور انھیں بسہولت قرضہ حاصل کرنے میں مدد دی جاتی ہے۔ بجلی کی طاقت ارزاں کر دی گئی ہے بنکی کاروبار شرح زر اور شغل اصل سب کو منضبط کیا گیا ہے۔ نتیجۃً اجناس کی قیمتیں گھٹ کر خرید و فروخت بڑھ گئی ہے اور ملک میں عام خوشحالی کا دور دورہ ہے۔ روس کے برعکس یہاں سرمایہ داری کی بنیاد قائم ہے۔ گو اس میں نا مداخلت کی پالیسی ترک کر دی گئی ہے۔ ان نئے تجربوں کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ جہاں معاشی کساد بازاری سے تخریب کا سا سماں تھا وہاں اب اس نئی تنظیم سے ایک نئی تعمیر کی صورت رونما ہو رہی ہے حقیقت یہ ہے کہ روزولٹ نے اپنے آپ کو دنیائے حاضر کا ایک بہترین مدبر و منظم ثابت کر دیا ہے۔ اس نے امریکہ کو سرد بازاری کے غار سے نکال کر گرم بازاری کی راہ پر لگا دیا ہے۔ اس نے حکمت اور حکومت کے امتزاج سے ایک مکمل تمدنی مرکب تیار کر کے دنیا کو دکھا دیا ہے کہ علم اور تنظیم مل کر نوع انسان کے لیے کیا کچھ کر سکتے ہیں!

بین الاقوامی حلقوں میں جرمنی کی طرح جاپان نے بھی دوسروں سے روگردانی اختیار کر لی ہے اور اس کی وجہ محض اس کی ہٹ دھرمی نہیں بلکہ اس کے خصوصی حالات نے اسے اس رویے پر مجبور کیا ہے پچاس برس میں جاپان کی آبادی تین کروڑ سے بڑھ کر چھ کروڑ ہو گئی ہے تعلیم کی ترقی کا یہ عالم ہے کہ ۹۷ فی صدی جاپانی لکھ پڑھ سکتے ہیں۔ اور مقابلے کی یہ حالت ہے کہ حال میں ۳۵-۱۹۳۴ فوجی اسامیوں کے لیے ۱۰۴۴۲ [illegible]یں

پیش ہوئیں۔ تمدن نے متمدن لوگوں کا حال ہر جگہ پتلا کر دیا ہے ہنگری کے ایک پروفیسر نے راقم کو بتایا کہ بڈاپسٹ کے شہر میں تھوڑی مدت ہوئی جب برف باری کے دنوں میں جاروب کشوں کی ضرورت پیش آئی تو پچاس ساٹھ اسامیوں کے لئے کم از کم تین چار ہزار امیدواروں کی عرضیاں آئیں جن میں سینکڑوں پروفیسر اور تاجر اور دیگر شریف آدمی شامل تھے۔ جاپان متمدن یورپ کا شاگرد رشید ہے۔ اس لئے وہاں بھی تنازع للبقا کا یہی حال ہے تعجب ہوتا ہے۔ جب اہل یورپ جاپان کو اپنے سے روٹھا ہوا دیکھ کر اسے برا بھلا کہتے ہیں۔ جاپان نے جو کچھ یورپ سے سیکھا ہے وہ کیسے اپنی ترقی کے لئے اسے استعمال نہ کرے؟ محض اس وجہ سے نہ کرے کہ اس میں بچارے بھلے مانس یورپ کا نقصان ہے جاپان لیگ سے علیحدہ ہو چکا ہے عنقریب اس انقطاع تعلقات کا آخری مرحلہ پیش ہوگا۔ اور اس پر بحر الکاہل کے ان جزائر کی ملکیت کا سوال بھی اٹھے گا جو لیگ نے جاپان کے سپرد کئے تھے چین سے جاپان پہلے ہی الجھا ہوا ہے کیونکہ اس نے مہذب قوموں کی طرح اپنے کمزور ہمسائے پر پہلے ہاتھ صاف کیا قزاقی کے اس اقدام میں اس نے مغربی قوموں کو صاف لفظوں میں "چین سے پرے ہٹ جاؤ" کا حکم سنا دیا ہے۔ بھاری بھرکم روس بھی اس سے ڈر رہا ہے۔ اور اس سوچ میں ہے کہ کس طرح سائبیریا کے علاقے کو جاپانی دستبرد سے محفوظ رکھے۔ اسی لئے اس نے دوسری دول سے معاہدوں اور سمجھوتوں کا ایک سلسلہ قائم کر لیا ہے۔ ممالک متحدہ جو بحر الکاہل کی سب سے زبردست طاقت ہے۔ وہاں جاپان کی بڑھتی ہوئی قوت کے آگے اپنی طاقت کو برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ اسے خوف ہے کہ دس بارہ برس میں جب وعدے کے مطابق وہ جزائر فلپائن کو آزاد کر دیگا تو جاپان ان پر قبضہ نہ جمالے۔ اور پھر یہ دست درازی دوسری پیش قدمیوں کا پیش خیمہ نہ بن جائے۔ علاوہ بریں جاپان نے بحری کانفرنس میں امریکہ اور انگلستان کے آگے بحری معاہدۂ واشنگٹن کی ترمیم بلکہ تنسیخ کا مسئلہ چھیڑا ہے کہ اسے بحری طاقت میں ۳-۵-۵ کی نسبت قابل قبول نہیں بلکہ حالات ایسے ہو چکے ہیں کہ اب اسے اس بارے میں مساوات درکار ہے۔ انگلستان اور امریکہ اس مطالبے کو ماننے کے لئے تیار نہیں اور جاپان جرمنی کی طرح اپنے انسانی حق مساوات پر مصر ہو رہا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ جاپان نے متمدن زندگی کے ہر شعبے میں تحیر خیز ترقی کر لی ہے وہ جہاں کہیں پہنچتا ہے وہاں دیکھتا ہے کہ کوئی نہ کوئی مغربی دولت اشیاء پر پہلے سے قبضہ جمائے بیٹھی ہے! چونکہ تمدن کے حلقے میں قبضہ طاقت پر منحصر ہے اور جاپان اپنے جسم و جان میں طاقت محسوس کرتا ہے لہذا وہ بھی مقبوضہ اشیاء میں اپنا حصہ طلب کرتا ہے۔ اس پر مغرب کے عقلمند اپنے گستاخ شاگرد پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور اسے طرح طرح سے سمجھاتے ہیں کہ کسی طرح وہ ان کی سی ٹیڑھی چالوں سے باز آ جائے۔ مگر وہ بھی اپنے بزرگ استاد کا پورا پورا پیرو ہے منہ پھیر لیتا ہے اور سیدھا آگے کو بڑھے جاتا ہے۔ عالمگیر سرد بازاری کے گزشتہ پانچ سال میں دو ملکوں کی معاشی خوش حالی نے کاروباری دنیا کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ ایک روس اور دوسرا جاپان۔ اس مدت میں جاپان کی مصنوعات بعض دگنی بعض چوگنی اور بعض سات گنی ہوگئی ہیں۔ دنیا کی منڈیاں خود مغربی ملکوں کے بازار جاپان کی ارزاں اشیاء سے بھرے پڑے ہیں جن کے مقابلے کی کوئی تاب نہیں لا سکتا۔ اور واقعی اس ملک کے ساتھ مقابلہ دشوار ہے جس میں حب الوطنی، تن دہی اور ارزانی کا وہ عالم ہو جو جاپان میں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بہت سے صنعتی کارخانوں میں جاپانی مزدور تین آنے میں دن میں تین مرتبہ خوب پیٹ بھر کر کھانا کھا سکتا ہے۔ اس سیاسی و تجارتی مقابلہ کا نتیجہ ہے کہ جاپان متمدن دنیا سے علیحدہ اور تنہا ہو رہا ہے چین

روس، امریکہ، انگلستان۔ انگلستان کا بچہ آسٹریلیا جاوا، سماٹرا والے ڈچ سب سے خائف ہیں اور اس لئے ناراض۔ یوں جنگ جاپان کے لئے بھی مفید نہیں اور پھر جنگ بھی ایسی جس میں ممکن ہے کہ یہ سب کے سب حریف بیک وقت شریک ہوجائیں لیکن دقت یہ ہے کہ اب ترقی و تمدن میں سکون ممکن نہیں اور توقف جبت کا مترادف ہوگیا ہے اور اس لئے بدقسمتی سے جنگ کی تیاری خودداری بلکہ صلح جوئی کے اظہار کے لئے بھی ضروری ہوچکی ہے۔ ساری متمدن دنیا کا یہی حال ہے۔ سو غریب جاپان کے لئے بھی اس کے سوا چارہ کار نہیں!

یہاں گنجائش نہیں کہ دنیا کے دوسرے ملکوں کا بتفصیل ذکر کیا جائے۔ چین کی ایک منظم جماعت اس کی آزادی اور ترقی کی خواہاں ہے لیکن ترقی بغیر امن واتحاد کے ممکن نہیں۔ اور چین میں اگر ایک طرف شمالی ریاستیں قائم ہیں تو دوسری طرف اجنبیوں اور خصوصاً جاپانیوں کی ہوا و ہوس نے ابتری پھیلا رکھی ہے۔ ترکی کی رفتار ترقی کا اس ذرا سی بات سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ترکی کے سب سے بڑے بنک کا نائب ناظم ایک مرد نہیں بلکہ ایک خاتون ہے۔ ایران اور ترکی میں مفاہمت اور اتحاد کی صورت پیدا ہو رہی ہے۔ افغانستان لیگ اقوام کا رکن بن گیا ہے۔ آسٹریا نے اپنے ہی جرمن نازیوں سے ڈر کر اطالیہ کی گود میں پناہ لی ہے۔ یوگو سلاویا نے اپنے بادشاہ کے قتل پر ہنگری کے "جبریہ" TERRORIST فرقے کو مورد الزام قرار دیا ہے اور لیگ کے آگے فریاد کی ہے۔ آئرستان انگلستان سے ہر ممکن رشتے کو توڑنے میں مصروف رہا ہے۔ مصر کے داخلی معاملات میں برطانیہ مخل ہوا ہے اور پیراگوے (جنوبی امریکہ) نے لیگ کا مشورہ سننے اور اس کی بات ماننے سے صاف انکار کردیا ہے۔

ہندوستان میں بہت سے اہم واقعات پیش آئے۔ شروع سال میں بہار میں ایک ہیبت ناک زلزلہ آیا۔ پھر گاندھی جی نے ترک موالات کی حکمت عملی کو ترک کرکے کانگرس کو کونسلوں کے ذریعے سے حکومت پر دباؤ ڈالنے کی اجازت دے دی اور خود علاوہ ہریجنوں کی اعانت کے ملک کی دیہاتی صنعتوں کے احیا میں مصروف ہونے کا تہیہ کیا۔ ملک نے انتخابات میں کانگرس کا توقع سے بڑھ کر ساتھ دیا اور یہ خیال ہر طرف پھیلا کہ بجائے روحانی طور پر روٹھے رہنے کے ہر جسمانی و دماغی کوشش صرف کرنی چاہیئے کہ قوم کی آواز نہ صرف ملک کے کونے کونے میں بلند کی جائے بلکہ اپنے حکمرانوں اور دنیا کے کانوں تک بھی پہنچائی جائے۔ اُدھر حکمران قوم نے اپنی ایک "منتخب جماعت" کی رائے کی اشاعت کی کہ ہندوستان کو خود اختیاری حکومت نہایت آہستہ آہستہ اور محض ذرا ذرا سی دی جائے۔ اور ایسی رائے کیوں کر قائم نہ ہوتی جب محکوم قوم کی ذہنیت ہنوز محکوم اور وہ محض کہنے کو ایک قوم ہے۔ جب اس کے افراد اس حریت کے زمانے میں بھی بجائے اتحاد و آزادی کے محض خودغرضی اور بندش کے نام لیوا ہیں۔

یہ ملکوں اور قوموں کا حال ہے۔ ان میں سے اکثر کے دل غصے اور کینے سے بھرے ہوئے ہیں جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ سب کے سب ایک دوسرے سے خائف ہیں کسی کو کسی پر اعتماد نہیں اور سیاسی و معاشی مسائل کا ہجوم تمدن میں ایک ابتری سی پھیلا رہا ہے جس کے باعث حکمت عملی میں یک جہتی اور عاقبت بینی اور بھی کم ہوگئی ہے۔ مختلف ملک ایک دوسرے سے معاہدے کررہے ہیں۔ تاکہ کوئی اس خطرناک زمانے میں اکیلا نہ رہ جائے۔ ۱۹۳۴ء میں ترکی، رومانیا، یونان اور یوگوسلاویا نے ایک بلقانی معاہدے پر دستخط ثبت کئے جسے نہ بلغاریہ نے پسند کیا اور نہ آسٹریا اور

اطالیہ نے آسٹریا اور اطالیہ اور ہنگری نے بھی اپنا ایک معاہدہ وضع کیا اور پھر مسولینی کی تجویز پر اطالیہ، انگلستان، فرانس اور جرمنی نے اپنا ایک جدا عہدنامہ مرتب کر لیا۔ مسولینی چھوٹی ریاستوں کا اصولاً مخالف ہے۔ وہ بارہا کہہ چکا ہے کہ دنیائے حاضر چھوٹی حکومتوں کی متحمل نہیں ہو سکتی اور حالات کا تقاضا ہے کہ صرف بڑی دولتیں پھولیں پھلیں اور صرف انھیں کی حکمت عملی تمدن کی سمت نمائی میں کارزیا ہو۔ اس نفسا نفسی میں **بین الاقوامیت** کا جو حال ہے وہ ظاہر ہے۔ ان مختلف الاضلاع شکلوں کے سامنے لیگ فقط ایک لکیر سی ہو کر رہ گئی ہے اور اس کے کارکن محض لکیر کے فقیر۔ فقیر انھیں کوئی بھی نہیں پوچھتا۔ لیگ کی کس مپرسی اور کم زوری کا یہ عالم ہے کہ بمقابلہ ۱۹۱۳ء کے دنیا نے ۱۹۳۲ء میں سامان جنگی پر ۶۳ فی صدی زیادہ روپیہ صرف کیا۔

معاشرت و حکومت کے **تین بڑے نظام** اس وقت ایک دوسرے کے مد مقابل ہو رہے ہیں۔ **جمہوریت** جو نامداخلت اور آزادی کو اپنا اصول بنائے ہوئے ہے۔ **فاشیت** جو مکمل انسان کا مصالحہ لے کر اجتماعی نقطۂ نگاہ سے ایک قومی عمارت کھڑی کرنے کے درپے ہے۔ اور **اشتمالیت** جو نوع انسان کی بہتری اس میں سمجھتی ہے کہ جماعتیں ایک مزدور جماعت میں مدغم ہو کر معاشی مساوات کے ذریعے سے دنیا کو ایک جنت بنا دیں۔

علاوہ بریں مختلف قسم کی **جماعتوں میں مناقشے** برپا ہیں۔ قوموں کی حالت ہم دیکھ چکے۔ نسلیں بھی اسی حال میں ہیں۔ گورے، کالے، حبشی، یوریشین سب ایک دوسرے کو حقارت سے دیکھتے ہیں۔ اونچے، درمیانے اور نچلے طبقے ایک دوسرے کو پاؤں تلے روندنے کی تجویزوں میں مصروف ہیں۔ مذہبی معرکوں کی چیخ پکار اب کم سنائی دیتی ہے لیکن اس کی بجائے اب اور آوازیں اٹھتی ہیں۔ ادھر عورت مرد کی بہتری و بدتری کا شور سنائی دیتا ہے تو ادھر بوڑھوں اور نوجوانوں کی تو تو میں میں کا بڑھتا ہوا غل ہے اور اسی پر بس نہیں۔ انتہا یہ ہے کہ خود فرد کے نفس میں مختلف خیالات و احساسات میں ایک مسلسل جنگ ہو رہی ہے۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمدن کی حالت اس وقت ایک جوشیلے مریض کی سی ہے کہ جو اپنے غم و غصہ میں اپنے ہی پاؤں پر کلھاڑی مارنا چاہتا ہے۔ تمدن کے امراض اور مختلف الرائے اطبا نے دیوانہ سا بنا دیا ہے۔ گو عجب نہیں کہ یہ دیوانہ بکار خود ہوشیار ثابت ہو اور یہ جوش و خروش بتدریج با قاعدہ قلبی و دماغی حالت میں تبدیل ہو کر دنیا کے لیے ایک خوشتر صورتِ حالات پیدا کر دے۔ نوع انسان کو طبیعیات کی ترقی نے بزعم خود آسمان پر اور نفسیات کی تفتیش اسے اپنے نفس کی گہرائیوں تک لے گئی۔ یوں انسان زمین و آسمان کے قلابے ملانے لگا لیکن جب تک معاشیات تنظیمِ ریاست میں مساوات، جماعت بندی میں عدل و انصاف اور علم و ہنر میں ضبط و حسن کاری کو مد نظر نہ رکھے گا اس کی خوشیاں غم و تشویش اس کی کامرانیاں سب کی سب ناکامیوں میں تبدیل ہو جائیں گی۔

انسان کی زندگی آج ایک سخت مشکل میں گھر رہی ہے لیکن یہ امر یقینی ہے کہ اگر وہ اپنی عقل و ہمت سے کام لے گا تو یہ مشکل خود آ کے لیے ہزاروں شاندار جدتوں کا دروازہ کھول دے گی!

بشیر احمد

کون ہے؟

کون کہنا چاہتا ہے مجھ سے اپنے دل کا راز،
یہ ہواؤں میں ہے کس کے سانس لینے کا گداز
کس کا سایہ کانپتا ہے یہ در و دیوار پر
جھانکتا ہے کون ظلمت کا دریچہ کھول کر
یہ مرے سینے میں اے شب سسکیاں لیتا ہے کون،
یہ اندھیرے میں مجھے پیغام سا دیتا ہے کون
کس سے میں پوچھوں یہ کیا انداز، یہ کیا طور ہے
خود یہ دل ہی کے کرشمے ہیں، کہ کوئی اور ہے

جوش

اذان

افق سے سحر مسکرانے لگی — موذن کی آواز آنے لگی
یہ آواز ہر چند فرسودہ ہے — جہاں سوز صدیوں سے آلودہ ہے
مگر اس کی ہر سانس میں متصل
دھڑکتا ہے اب تک محمد کا دل

جوش

خوب و خوب تر

جو کچھ بھی ہے وہ خوب ہے کر اُس کو خوب تر!

یہ چہچہے　　یہ قہقہے
یہ پتیاں　　یہ لہلہے
یہ بحر و بر　　یہ خشک و تر
ہیں خوب تو مگر　　کر اِن کو خوب تر

جو کچھ بھی ہے وہ خوب ہے کر اُس کو خوب تر!

یہ نت نیا چمن ہے یہاں سیر کو نکل!

تُو بھی چہک　　تُو بھی لہک
کبھی مٹک　　کبھی ٹھمک
یہ بھول جا　　کہ ہوگا کیا!
بھول اور پھول پھل　　فرصت ہے پل کی پل

میٹھا سا گیت گا کوئی اور اس چمن میں [illegible]

تجھ کو ملی تھی عقل، وفا، آن اِس لئے ؟

یہ معرکے یہ مخمصے
مُناقشے مباحثے
لڑائیاں بُرائیاں!
تو اس لئے جیئے؟ خونِ جگر پیئے؟

کم بخت! تو بنا تھا پھر انسان کس لئے ؟

تقدیر کارساز ہے تدبیر کار گر !

پروا نہ کر عُقبےٰ ہے کیا
دُنیا کو تُو جنت بنا
جی اور جِلا بُڑھ اور بڑھا!
ہر شے پہ رکھ نظر اور دیکھ اے بشر!

کون و مکاں وہ نخل ہے تُو جس کا ہے ثمر
جو کچھ بھی ہے وہ خوب ہے کر اُس کو خوب تر!

بشیر احمد

اے ہندوستان!

اے ہندوستان! تیرے بہتے دریا سے اپنی گاگر بھر کر وہ تیرے پیپل تلے آکھڑی ہے۔ وہ جس کا دل صدیوں سے اپنے شوہر اور اپنے بچوں کے لیئے دھڑکتا رہا ہے۔ وہ جس پر اس کے شوہر اور اس کے بچوں نے صدیوں ہی ظلم و ستم بھی توڑے۔ اس کی گاگر بس آج کل میں ٹوٹنے والی ہے!

وہ دریا۔ وہ بہتا پانی۔ وہ گھریلو دیوی۔ وہ مٹی کی گاگر ان سب کا دور ہو چکا۔ اب تو لوہے کے نل ہیں۔ اور موٹر کار اور ڈبے کا فوا اور مُنڈی بھوؤں والی انگریزی بولتی ہوئی نازک میمیں۔ اب تو پیپل کے پیڑوں کی فقط تصویریں ہیں۔

نہیں نہیں یہ حال وہاں ہے جہاں قصبے پھیل کر شہر بن گئے ہیں۔ جہاں شہر زادی پڑیوں کی باہیں پھیلا کر ایک دوسرے کے گلے ملنے کی فضول کوشش میں ہانپ رہے ہیں کہ وہاں دریا ہیں تو گدلے اور پیپل ہیں تو ناپاک اور عورتیں ہیں تو بجائے گاگر سر پر نولے بھاری ہم کتابوں سے لدی پھرتی ——— لیکن وہاں اے ہندوستان! جہاں تیرے وسیع میدانوں میں دریا بہتے ہیں۔ اسی شان کی آن بان کے ساتھ جہاں ہوائیں کبھی تیز کبھی مدھم، اب بھی پیپل کے پتوں میں سے سرسراتی ہوئی گزرتی ہیں۔ وہاں اے پیارے وطن اے رنج و محن! وہاں اب بھی اپنی اپنی گاگر کو سر پر سنبھالے ایک دو نہیں بیسیوں۔ وہ سادہ دل جفاکش ہستیاں تیری پگ ڈنڈیوں پر صبح شام آتی جاتی ہیں جن سے میدانوں کی آرائش اور زمین و آسمان کی زیبائش ہے۔ اے میرے مجبور و مقہور وطن!

سو آن کو اے وطن! جو تیری بیڑیاں کاٹنے کو شہروں میں شور و غل مچانے پھرتے ہیں ان کو ان سرسبز و شاداب ویرانوں میں بلا، جا انھیں یہاں کھینچ لا یہاں جہاں نہ بندش ہے۔ نہ غلامی، جہاں نہ کالے ہیں نہ گورے۔ جہاں صبح کے سنہری تخت پر نہیں بیٹھتے بلکہ ننھی چڑیاں کھیلتی ہیں۔ جہاں کے دریاؤں کے اوپر پُل نہیں بندھتے بلکہ جہاں ان کے کناروں پر قدرت اپنی پیاس خود چلّو بھر بھر کر تازہ پانی پلاتی اور مسکراتی ہے۔ اے میرے ہزاروں نعمتوں سے مالامال وطن!

ب۔ ت

چینی نظم کا تتبع

اگر تم شاعری کے نشہ میں چور نہ ہوئے یعنی تمہارا دماغ بحر و قوافی کی قیود سے آزادی ہوا تو شاید تم میری مندرجہ ذیل کوشش کو ناپسند نہ کرو میں خوب سمجھتا ہوں کہ یہی چیز تم نہایت خوبصورت الفاظ اور بندشوں سے کہہ سکتے ہو مگر وہ الفاظ اور بندشیں اب رسمی ہوگئی ہیں۔

(۱)

کل شب
مری ماہ پارہ
شاداں، رقصاں
آنکلی کہیں سے

(۲)

بولی
"چاند کی سیر کو چل تو
بیگانہ نہ بن تو
مجھے ہے الفت
تجھے ہے فرصت
ٹال نہ میرا کہنا"

(۳)

اور
لپٹی ہوئی مجھ سے
وہ نازکی پتلی
صحنِ باغ میں ٹہلی +

(۴)

صبحدم
ہوں میں پریشاں
غالب ہے گماں،
افسانہ تھا یہ سب

(۵)

کون
کہہ سکتا ہے
ماجرا سارا
یہ تھا کہ نہ تھا؟

"فلک پیما"

یہ تیز رَو زمانہ

بیسویں صدی کے پہلے تینتیس ۳۳ سالوں کی معنی خیز داستان

(سنہ ۱۹۰۰ء تا سنہ ۱۹۳۳ء)

بیسویں صدی کے پہلے تینتیس سال ایک عجیب وغریب زمانے پر مشتمل ہیں۔ واقعات بلکہ تحریکات بھی کبھی اس سے پہلے ایسی سرعت کے ساتھ ظہور میں نہیں آئیں۔ اس عہد میں زمانے کی رفتار اس قدر تیز ہوگئی کہ ہماری ایک عمر میں گویا بیسیوں عمریں گزر گئیں۔ ہم سے پہلے نوع انسان کی ہزاروں پشتیں آئیں اور چلی گئیں اور ان میں سے بعض نے معاشرت کو بدلتے دیکھا بعض نے پرانے ادارات کو تہ و بالا ہوتے دیکھا لیکن ان سب کے اساسی خیالات کا بیشتر حصہ ہمیشہ برقرار رہا۔ حکومتیں مٹ گئیں۔ مذہب کا رنگ کاواہ ہوگیا لیکن انسانی فطرت جوں کی توں رہی اور دنیا و کائنات کے آئین و قوانین بدستور قائم رہے!

اس کے برعکس ہمارا زمانہ پہلا زمانہ ہے جس میں یہ بظاہر غیر متغیر سلسلہ آکے ٹوٹا۔ ہماری پشت پہلی پشت ہے جس کے نہ صرف سیاسی و معاشری خیالات میں ایک انقلابی تبدیلی واقع ہوئی ہے بلکہ جس کے نزدیک زندگی و کائنات کے بنیادی اصول و قوانین جو ہمیشہ سے اٹل سمجھے جاتے تھے متزلزل ہو کر ایک نئے سانچے میں ڈھل گئے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے لاکھوں برس ہوئے۔ حجر یہ زمانے سے لے کر انیسویں صدی تک محض ایک زمانہ ہے اور ہماری زندگی ایک بالکل دوسرا زمانہ۔ اس لئے کہ ہمیں پہلے لوگ ہیں جنھوں نے سمجھ لیا ہے کہ ہمارا ماحول اب کبھی مستقل طور پر قائم نہ رہے گا بلکہ اس کا نقشہ روز بروز تبدیل ہوتا رہے گا۔ ہم نے جانچ لیا ہے کہ دنیا اور کائنات کی کوئی قائم و دائم بنیاد نہیں ہے۔ ہمیں پہلے انسان ہیں جنھیں اس امر کا احساس ہوا ہے کہ نہ محض معاشرتی نظام بلکہ قدرتی نظام بھی ہمارا ہی ساخت کردہ ہے۔ اور جب ہم بدلتے ہیں تو ہمارے ساتھ یہ دونوں بھی بدل جاتے ہیں۔ گزشتہ لوگوں نے بیرونی قدرت کو اس لئے اٹل سمجھ لیا کہ وہ اپنی اندرونی فطرت سے بخوبی آگاہ نہ تھے۔ انسانی فطرت اس قدر آہستہ گام زن تھی کہ بیرونی دنیا کا عکس جو اس میں پڑتا تھا وہ ہمیں حقیقت معلوم ہوتا تھا!

لیکن یہ امر کہ ہر شے اس قدر سرعت کے ساتھ بدل رہی ہے۔ اور بالخصوص یہ انکشاف کہ ہر شے ہمارے ارادے سے اس

تک بدلی جاسکتی ہے حد درجہ درد انگیز ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے حالات اور ہمارا ماحول اس قدر بدل سکنے والا ہے تو ہم ڈر جاتے ہیں کیونکہ یہ امر ہماری ذمہ داری کو بدرجہا بڑھا دیتا ہے پھر ہم الگ تھلگ ہو کر اور محض واقعات وحالات کو قابل الزام ٹھہرا کر قانع نہیں رہ سکتے !

"گزشتہ تینتیس سال پر نظر ڈالنے سے نہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ زمانہ بہت سریع السیر ہے بلکہ یہ بھی صاف طور پر عیاں ہو جاتا ہے کہ ہم لوگ اس صریح حقیقت کے سمجھنے اور دیکھنے سے عمداً جی چراتے ہیں۔ جو کچھ ہوا ہے اور ہو رہا ہے ہم اس کی طرف سے گویا آنکھیں بند کئے بیٹھے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم نے نئی سے نئی طاقتیں حاصل کر لی ہیں اور قدرت کے کئی بھید، ہمارے اپنے دلوں کے کئی بھید ہم پر منکشف ہو چکے ہیں پس اس انکشاف کے بعد بھی اگر ہم تجاہل عارفانہ سے کام لیں گے تو ہمارا انجام یقیناً خطرناک ہوگا ہمارے لئے لازم ہے کہ ہم اپنی ان نئی طاقتوں کے لئے نئے سطح نظر ڈھونڈیں۔ اپنے خیالات کو بدلیں۔ اپنے نصب العین کو بدلیں اور اپنی نئی دنیا میں گویا ایک نئی با اختیار مخلوق ہو کر رہیں سہیں !

۱۹۳۴ء میں ایک مغربی مفکر جیرلڈ ہیرڈ نے ۱۹۰۰ء سے لے کر ۱۹۳۳ء تک کے زمانے کی ایک مختصر تاریخ "یہ تیز رو زمانہ" کے نام سے لکھی ہے جس میں اس نے یہ ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ ہمارے عہد کے تمام بیرونی حادثات یعنی تمام لڑائیوں، انقلابوں ایجادوں، دریافتوں اور نظریوں کی ظاہری کشمکش کے نیچے ایک عالمگیر زلزلہ نما تحریک بپا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ ہماری اس تمام ظاہری افراتفری اور گڑبڑ کے پس پشت فی الحقیقت انسانی نفس کا روز افزوں شعور کار فرما ہے۔ ایک نئے انقلابی علم کا شعور، علم قدرت کے مظاہر کا علم، بطون فطرت کا اور اس پراسرار تعلق کا جو قدرت و فطرتِ انسانی میں پیدا ہے! وہ کہتا ہے کہ اکثر لوگ اس علم سے جان بوجھ کر منہ پھیرے ہوئے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ دورِ حاضر کے سیاسی و معاشری انقلاب فقط بیرونی واقعات مثلاً معاشی سرد بازاری، معاشری تفریق، قومی روایات کے عارضی سے نتائج ہیں لیکن ایسا خیال محض فضول اور بغایت مضرّت رساں ہے حقیقت یہ ہے کہ تمام ظاہری واقعات کے نیچے بعض مخصوص تحریکات کام کر رہی ہیں اور پھر ان تحریکات کے اور نیچے ایک گہرا نیم شعوری زبردست رجحان ہے جو ہماری دنیا کو کہیں سے کہیں لئے جاتا ہے۔ تمام واقعات وتحریکات کی صحیح علت غائی یہی رجحان ہے جو ہمارے زمانے کی مخصوص علامت ہے۔

اگر ہم اس چھپے ہوئے رجحان اس زبردست زلزلے کی عظیم الشان حرکات سے تباہ نہیں ہونا چاہتے ؛ اگر ہم اس سے اپنی زندگیوں کو مسرور و کارآمد بنانے کے آرزومند ہیں تو ہمیں اس عالمگیر حادثے سے گھبرا نہ جانا چاہیئے بلکہ بیدار و ہوشیار ہو کر دیکھنا چاہیئے کہ اس زمین دوز حرکت کی سمت کیا ہے! غالب ہے کہ ہم اس بظاہر جاں کاہ حادثے کو سمجھ سکیں گے۔ پھر یقیناً ہم یا ہمارے بعد میں آنے والے لوگ جو ہمارا فراہم کردہ مواد استعمال میں لائیں گے ایک قطعاً نیا پائدار "فطری" نظام تعمیر کر سکیں گے !

THESE HURRYING YEARS BY GERALD HEARD (1934)

مقالہ مذکور نے بیسویں صدی کے پہلے تینتیس سالوں کو چار زمانوں میں تقسیم کیا ہے۔ اوّل سنہ ۱۹۰۰ء تا سنہ ۱۹۱۰ء۔ دوم سنہ ۱۹۱۰ء تا سنہ ۱۹۱۹ء، سوم سنہ ۱۹۱۹ء تا سنہ ۱۹۲۹ء، چہارم سنہ ۱۹۲۹ء تا سنہ ۱۹۳۳ء۔ اس نے ہر زمانے میں پہلے "بیرونی منظر" کو لیا ہے یہاں اس نے معمولی سیاسی، اور بظاہر اہم واقعات کی تاریخ لکھی ہے پھر اس نے "پس منظری قوتوں" پر نظر ڈالی ہے۔ یہاں اس نے مختلف النوع معاشری وعلمی تحریکات کو بیان کیا ہے۔ آخر میں اس نے ایک "مخفی رجحان" کا انکشاف کیا ہے یہاں اس نے فنون لباس وغیرہ کی تبدیلیوں کا اندازہ کیا ہے۔ اور یہ نکتہ سمجھایا ہے کہ کسی زمانے کے اصلی میلان کا پتہ انہیں باتوں سے چل سکتا ہے جو بظاہر بالکل غیر اہم ہوں کہ یہی دراصل اس زمانے کے رجحان کا صحیح آئینہ ہوتی ہیں۔

حصّہ اوّل

سنہ ۱۹۰۰ء تا سنہ ۱۹۱۰ء

(بیرونی منظر)

ہماری یہ تاریخ سنہ ۱۹۰۰ء میں شروع ہوتی ہے۔

صدی کے آغاز میں دول یورپ نے چین کو اپنے تجارتی تشدد کا نشانہ بنایا۔ اس پر بعض چینیوں کی برافروختگی نے "بوکسر" یعنی "مکے بازوں" کی بغاوت کی شکل اختیار کی جسے مہذب اجنبیوں نے بڑے ظلم وستم کے ساتھ فرو کیا۔ اور پھر ایک بہت بڑا تاوان ان غریبوں سے وصول کیا۔

جاپان اس سے پہلے ہی چین سے اپنا لوہا منوا چکا تھا۔ جولائی سنہ ۱۸۹۸ء میں ممالک متحدہ (امریکہ) نے ہسپانیہ کو شکست دے کر فلیپائن کے جزائر کو حاصل کیا۔ ان فتح مندیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ بحر الکاہل میں فقط دو طاقتوں کا یعنی جاپان اور امریکہ کا ڈنکا بجنے لگا۔ ہاں برطانیہ بھی اپنی سلطنت کو استوار رکھنے کا خواہشمند تھا۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں آسٹریلیا کی حکومت کو ایک دولت عامّہ قرار دیا گیا۔ اسی سال جنوبی افریقہ میں برطانیہ اور بوئروں کے درمیان جنگ چھڑ گئی جو سنہ ۱۹۰۲ء تک جاری رہی۔ برطانیہ بظاہر کامیاب ہو گیا لیکن مجبور ہوا کہ بوئروں کو خود اختیاری حکومت کا وعدہ بھی دے۔ اس وقت انگلستان میں قدامت پسندوں کی حکومت تھی جو ایک عالمگیر برطانوی سلطنت کے دل دادہ اور علم بردار تھے۔ جنوبی افریقہ، مصر، آسٹریلیا، کینیڈا۔ اس زنجیر کی چند کڑیاں تھیں۔ اور ان کو ہر ممکن ذریعہ سے روز بروز مربوط و مضبوط کرنا مقصود تھا۔ اسی لئے قاہرہ سے راس امید تک ایک خالص برطانوی ریل کی تجویز کی گئی اور اسی لئے سنہ ۱۹۰۲ء میں برطانیہ نے جاپان کے ساتھ معاہدہ کیا اور اپنی بحری طاقت کی طرف بیش از بیش توجہ کی لیکن جس طرح قدامت پسند کی تحریکِ محاصل ناکام رہی۔ اسی طرح برطانوی سلطنت کا یہ عظیم الشان منصوبہ بھی بالآخر اس حد تک کامیاب نہ ہو سکا جس کی توقع تھی۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ دنیا کے حالات ایک واقعی مستقل برطانوی سلطنت کی کامرانی کی راہ میں حائل تھے۔ یورپ کا سیاسی

کمزور ہو رہا تھا سلطنتِ ترکیہ متنزل ہو رہی تھی۔ روس جاپان سے برسرِ پیکار تھا اور ممالکِ متحدہ (امریکہ) انگلستان کا مدِ مقابل بننے کا خواہشمند تھا۔ اور خود برطانوی سلطنت کے بعض حصص میں شورش کے آثار نمایاں تھے یہاں تک کہ روس و جاپان کی جنگ میں جاپانی کامیابی نے سوتے ہوئے ہندوستان کو بھی ذرا سا جگا دیا تھا اور لارڈ کرزن کی مستبدانہ روش نے تقسیمِ بنگال کی چھیڑ چھاڑ سے ملک میں ۱۹۰۵ء ایک قومی تحریک پیدا کر دی تھی۔ جدت پسند مارلے کی ریفارم سکیم نے اس تحریک کے بانیوں کی اشک شوئی کرنی چاہی لیکن نتیجہ زیادہ خاطر خواہ نہ ہوا۔ بات یہ ہے کہ جاپان کی جنگی کامیابی نے ادھر مہذب دنیا کو حیرت میں ڈال دیا اور ادھر مشرق کو اپنی مدتوں کی نیند سے بیدار کر دیا۔ عہدِ حاضرہ کی تاریخ میں اس جنگ کی بڑی اہمیت ہے۔ اس سے یورپ کے توازنِ قوت میں خلل پیدا ہو گیا۔ روس کا زیادہ کمزور ہو جانا اس توازن کے لئے تسلی بخش نہ تھا۔ نتیجۃً انگلستان فرانس کی طرف مائل ہونے لگا۔ اس جنگ سے طریقۂ حرب پر بھی نئی روشنی پڑی۔ جنگی محاذ اس قدر وسیع ہوئے کہ سپہ سالار اب میدانِ جنگ کی بدلتی ہوئی حالت سے بخوبی آگاہ نہ ہو سکتے تھے۔ گولے بارود کی اہمیت بڑھ گئی۔ اور بمقابلہ جارحانہ کارروائی کے مدافعانہ طرزِ جنگ کے فوائد ظاہر ہونے لگے۔ واقعات کا رنگ ایسا ہوا کہ سیاسی دنیا میں پہلے سے امن و اطمینان کی گنجائش نہ رہی۔ زبردست انگلستان کی الگ تھلگ حکمتِ عملی قائم نہ رہ سکی۔ اور اس کے "جدت پسند" طبقے کی بے نیازی بھی طوعاً و کرہاً یورپی سیاسیات اور رقابتوں کی طرف متوجہ ہونے لگی۔ ۱۹۰۶ء میں انگلستان اور فرانس نے الجیری کانفرنس میں طے کر لیا کہ مراقش فرانس کے زیرِ اثر رہے گا۔ اور وہاں جرمنی کا دخل محض دخل درمعقولات سمجھا جائیگا۔ ۱۹۰۷ء میں انگلستان نے ایک طرف تو اپنے نئے حلیف فرانس سے بری و بحری فوجوں کی تقسیم و تعیین کے متعلق گفت و شنید کی اور اپنے بحرِ روم کے بیڑے کا بیشتر حصہ بحیرۂ شمالی کی طرف منتقل کر لیا۔ اور دوسری طرف اس نے اپنے پرانے رقیب روس سے ایران وغیرہ میں حلقہائے اثر کے متعلق مفاہمت کر لی۔ ان تمام شرطوں اور سمجھوتوں سے جرمنی یہی سمجھا اور اس کا یوں سمجھنا ایک فطری امر تھا کہ وہ سیاسی دنیا میں علیحدہ کیا جا رہا ہے اور بے یار و مددگار ہو رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم کی بنیادیں قائم ہو رہی تھیں جنگ سے گریز کرنے والی "جدت پسند" جماعت بھی جو انگلستان میں برسرِ اقتدار تھی باوجود اپنی آزاد خیالی کے اپنی احتیاطوں ہی کے طفیل جنگ کی زنجیروں کو گویا اور مضبوط کر رہی تھی اور امن و امان کے متزلزل کرنے میں ممد و معاون ہو رہی تھی۔ چنانچہ ۱۹۰۸ء میں جب برطانیہ نے اپنے ڈریڈناٹ ("نڈر") جہازوں کی طرح ڈالی تو اس سے بحری رقابت کی رفتار دوچند ہو گئی۔ اسی سال میں شاہِ پرتگال قتل کیا گیا اور ترکانِ احرار نے سلطان عبدالحمید سے جو گو قدامت پسند تھا لیکن حریص یورپ کی چالوں کو خوب سمجھتا اور اپنی جوابی چال بازی سے اس کا سدِ باب کئے ہوئے تھا از سرِ نو اپنا سیاسی دستور حاصل کیا۔ ادھر آسٹریا نے آن کی آن میں ترکی کے دو ملحقہ صوبے بوسینیا اور ہرزیگوینا دبوچ لئے۔ روس کہ ابھی اس نوچ کھسوٹ کے لئے تیار نہ تھا دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا۔ یوں بغیر جنگ کا اعلان کئے دورانِ صلح

میں کسی کا مال جلدی اور آسانی سے سمیٹ لینے کے نئے مہذب طریقے کی ایک روشن مثال قائم کی گئی۔ برطانوی جدت پسند اپنی خانگی قانون سازی سے اپنی حریت کا ثبوت بہم پہنچاتے رہے۔ ۱۹۰۸ء میں مزدوروں کی اجرت[1] کا معیار بڑھایا گیا۔ اور ویلز کے کلیسا کی موقوفی[2] کا اعلان کیا گیا۔ ۱۹۰۹ء میں لائڈ جارج نے اپنا "جمہوری میزانیہ" پیش کیا۔ اور دار العوام اور دار الامراء کو دست و گریباں کر دیا۔ ۱۹۱۰ء میں وزیراعظم ایسکوئتھ نئے انتخابات کے ساتھ اپنے وہ اسی آئرش ارکان لے کر آیا جنھوں نے ہر بات میں جدت پسندوں کی حمایت کا اس کڑی شرط پر بیڑا اٹھایا کہ وہ آئرستان کو آزادی دلادیں غرض ۱۹۱۴ء تک کے زمانے کے خاتمے پر گو جدت پسند بظاہر حکمران تھے بگر ظاہر تھا کہ ان کی سیاسی جوڑ توڑ میں اصولی گڑبڑ ہو رہی تھی۔ یہ اس زمانے کی سب سے المناک کیفیت تھی کہ جدت پسندوں نے اپنی احتیاطوں اور بزدلی سے آپ اپنے پاؤں پر کلھاڑی ماری اور طاقت و صولت کے میدان میں قدامت پسندوں اور مزدوروں کے مقابلے کے لئے رستہ صاف چھوڑ دیا۔ اس زمانے کی دوسری اہم خصوصیت مہارت[3] کا نشو و نما اور ماہرین کی ترقی تھی۔ تمدن کے مختلف شعبوں میں بڑے بڑے قابل ماہرین فن پیدا ہوئے جن کی مہارت نے مختلف قسم کی انسانی مہارتوں کو درجۂ کمال پر پہنچایا۔ لیکن یہ مہارت اور یہ کمال، اندھا دھند اپنا کام کر رہے تھے۔ ماہرین کو مطلق خبر نہ تھی کہ ان کی محنت و مہارت تمدن کے کس کام میں لگائی جاتی ہے نتیجہ یہ ہوا کہ یہ نیک نیت نا آگاہ لوگ اپنے بعض چالاک ہم جنسوں کے ہاتھوں میں کٹ پتلی بن کر رہ گئے۔ جو اپنی اپنی خود غرضانہ یا کم اندیشانہ اغراض کے لیے ان کی ترقی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے خوگر ہو گئے۔ جیسا ہم آگے چل کر دیکھیں گے۔ یہ اسی جہل و دنائت کا نتیجہ تھا کہ نوع انسان تباہی کے تاریک رستے پر دھکیلی گئی اور شاعر کا یہ قول مہذب یورپ پر صادق آگیا کہ "تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی"! اس عہد کی تیسری خصوصیت شدید احساس کا مسلسل نشو و نما تھا! انسان جور و ستم اور تکلیف و کرب پر زیادہ گھبرانے اور خوف زدہ ہونے لگا۔ ان تمام خصوصیات کا ماحصل یہ تھا کہ انسانی روح اپنے ہی ساتھ برسرپیکار تھی اور اس کی قوت بجائے مجتمع ہونے کے منتشر ہو رہی تھی! انسان کے نفس میں ایک عظیم الشان جنگ چھڑ گئی تھی!

(پس منظری قوتیں)

اس زمانے کی سب سے نمایاں تحریک مزدوروں کی تحریک تھی جس میں تین عناصر کی آمیزش تھی! ایک عنصر انجمن اتحاد مزدوران تھا دوسرا اشتراکیت کی انقلابی تحریک اور تیسرا باقاعدہ علمی منصوبہ بندی[4] کا طریقہ جو روایات، مراعات اور توہمات کی مخالفت پر مبنی تھا! اس زمانے

---

[1] MINIMUM WAGE ACT

[2] WELSH CHURCH DISESTABLISHMENT

[3] SKILL

[4] SCIENTIFICALLY PLANNING METHOD

میں اتحادِ مزدوراں کی تحریک نے بہت فروغ پایا جس کا سب سے بڑا سبب تمام طبقوں میں عام فہم تعلیم کا رواج پاتا تھا۔ انگلستان میں ایک طرف ریمزے میکڈانلڈ کیئر ہارڈی وغیرہ نے مزدوروں کی سیاسی جماعت کو ترتیب دیا۔ اور دوسری طرف برنارڈ شا ویلز وولس وغیرہ نے نچلے طبقے کی حمایت میں ایک علمی جماعت کی بنیاد ڈالی سنہ ۱۹۰۰ء میں لندن یونیورسٹی کی ازسرِ نو تنظیم سے بھی مزدوروں کی تحریک کو تقویت پہنچی لیکن مزدوروں کی یہ مختلف حامی ایک ہی مضبوط سلسلے میں منسلک بتحد نہ ہو سکے۔ مزدوروں کی تحریک محض قومی سرحدوں تک محدود نہ رہی۔ چنانچہ اکتوبر سنہ ۱۹۰۵ء میں انگریزی جماعت نے جرمن مزدوروں کو ان کی ہڑتال میں اپنے محدود سرمایئے میں سے دو ہزار پونڈ کی گراں قدر رقم ہفتہ وار بھیجی۔ سنہ ۱۹۰۶ء میں پارلیمنٹ میں انتیس ۲۹ مزدور ارکان بھی آ داخل ہوئے لیکن تاہم اس تحریک میں کافی زور اور گرمجوشی پیدا نہ ہو سکی۔ اس کی وجہ صاف ظاہر تھی۔ اور وہ یہ تھی کہ معاشیات اور عقلیت جب تک نفسیات اور جذبات کی پُرجوش امداد سے مستفید نہ ہوں کوئی تحریک صحیح معنی میں زندہ و مُوثر نہیں ہو سکتی۔

وہ تحریک جس نے ان دونوں اہم عناصر کو اپنی ترقی میں استعمال کیا نسوانی تحریک تھی۔ عورتوں نے نشر و اشاعت اور اظہارِ جذبات سے بڑے جوش و خروش سے کام لیا۔ انیسویں صدی میں اس تحریک کی مخالفت شدید تھی۔ رومانی تحریک میں صنف نازک کی حیثیت سے عورت کی پرستش تک کی جاتی تھی لیکن اسی وجہ سے اسے مساوات بلکہ کئی ضروری حقوق تک حاصل نہ تھے۔ لہذا اب ایک طرف تو عورتوں نے علمی بغاوت کا جھنڈا بلند کیا۔ اور کہا کہ مردوں کی فوقیت کا نظریہ محض لغو ہے۔ اور دوسری طرف تشدد کے مختلف مظاہرے پیش کئے جلوس نکالے۔ دروازوں کھڑکیوں کے شیشے توڑے غرض خاص و عام کو ہر طرح تنگ کیا۔ یہ جارحانہ کارروائیاں خوب پھیل لائیں اور آگے چل کر عورتوں کو ان کے بعض حقوق مل گئے جس کا نہ صرف عورتوں پر بلکہ کئی دوسری جماعتوں پر خاص اثر پڑا اس زمانے میں حفظانِ صحت کے بعض نئے طریقے ایجاد ہوئے۔ فرائڈ کا نفسیاتی تجزیہ[۵۱]۔ تنویم[۵۲]۔ مسیحی حکمت[۵۳]۔ ان سب نے اپنے اپنے خیالات پھیلائے اور اپنے اپنے کرتب دکھائے۔ بالخصوص نفسیاتی تجزیے کے نظریات نے جو نفسِ انسانی کی نیم شعوری قوت اور اس کی جنسی جذبات کی پوشیدہ کشمکشوں پر مبنی تھے ذہنِ عامّہ پر خوب اپنا سکہ جمایا۔ ساتھ ہی یہ خیال بڑھا کہ صحت تمام جسمانی قوتوں کے اجتماعی فروغ کا نام ہے۔ اور یہ فروغ عام بود و باش تازہ ہوا اور روشنی۔ ورزش اور خوراک۔ اور آرام اور دلی و دماغی سکون سے حاصل ہوتا ہے لیکن پھر بھی حفظ صحت کے دائرے میں نئے خیالات والوں کو بوجہ اپنے اختلاف و تخالف کے پرانے ڈاکٹری علاج اور قدیمی نقطۂ نظر کے مقابل میں زیادہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی اور پرانی چیزوں کا بدستور دور دورہ رہا۔ گو نئے خیالات کی کرید دماغوں میں شروع ضرور

---

[۵۱] PSYCHOANALYSIS

[۵۲] HYPNOTISM

[۵۳] CHRISTIAN SCIENCE

ہو گئی۔

تفتیش و دریافت کے شعبے میں جو کچھ ہوا اُس کا نتیجہ پرانے اخلاق کی بیخ کنی کی ابتدا تھا۔ پیری ۱۹۰۹ء میں قطب شمالی میں جا پہنچا۔ غیر مہذب ملکوں کے اصلی باشندوں کے طرزِ معاشرت پر گہری علمی نظر ڈالی گئی اور مہذب انسان نوعِ انسان کے مختلف و متضاد اخلاق دیکھ کر سوچنے اور شک کرنے لگا کہ کیا صحیح اخلاق صرف وہی ہیں جنھیں میں صحیح سمجھتا رہا ہوں۔ علمِ انسان[51] انسانی بہتری کے آئندہ خیالات کو ایک نئے رنگ میں رنگنے والا تھا۔ یوں قدامت پھیکی پڑتی گئی اور وسیع النظری کی آب و تاب روز بروز بڑھتی گئی۔ نئے علمِ پیدائش[52] اور ضبطِ تولید نے کہا کہ آئندہ نسلوں کے لیئے بہتر و مضبوط تر بچے پیدا کرنا ممکن ہے۔ نئی نفسی[53] تفتیش نے نفس کی انوکھی قوتیں دریافت کیں "خیال رسانی[54]" نے خیال کو ایک جگہ سے دوسری جگہ ہزاروں کوس پر منتقل کر دکھایا۔ نئی روحانیت[55] نے بزعمِ خود مُردوں سے گفتگو کی راہ نکالی۔ اُدھر اصلاحِ معاشرت کے سلسلے میں نوجوان ملزموں کے ساتھ نرمی و ملاطفت کے سلوک سے ان کی اصلاح و ترقی کا رستہ نکلا۔ ۱۹۰۳ء میں انگلستان میں تہی دست غربا کی مفت وکالت کا انتظام کیا گیا۔ اور ۱۹۰۸ء میں بے روزگاروں کی امداد کا سلسلہ شروع ہوا کہ کیوں کر ان کے لئے کام مہیا کیا جائے۔ اسی سال میں بوائے سکاؤٹس کی تحریک کی بنا پڑی جو معاشری حیثیت سے بتدریج ایک نہایت نتیجہ خیز تحریک ثابت ہونے والی تھی۔

علمی تفتیش کے بعض عملی آلات نے انسانی بود و باش پر معتد بہ اثر ڈالنا شروع کیا۔ ۱۹۰۲ء میں مارکونی نے بحرِ اوقیانوس کے پار اپنا پہلا بے تار کا پیغام بھیجا۔ ۱۹۰۳ء میں موٹر کاروں کی رفتار بیس میل فی گھنٹہ پر پہنچ گئی۔ ۱۹۰۴ء میں پہلا سینما کھولا گیا۔ ۱۹۰۶ء میں ٹیلیفون کا رواج عام ہونے لگا۔ ۱۹۰۷ء میں ٹربائن کے موٹر کی کل نے بڑے بڑے جہازوں کو دخانی قوت سے بسرعت وسیع سمندروں کے پار لے جانا شروع کیا۔ ۱۹۰۹ء میں موسیو بلیریو اپنے طیارے میں بیٹھا۔ رودبار کے پار اڑتا ہوا انگلستان آ پہنچا۔

مغربی علم و ادب میں کپلنگ نے برطانوی سلطنت کا ڈنکا بجایا۔ ولز نے تمدن کا گیت گایا۔ ہنری جیمز نے انسانی سیرت اور انسانی معاشری نسبت پر روشنی ڈالی۔ میٹرلنک نے اپنی تصنیف "شہد کی مکھی کی زندگی" میں ثابت کیا کہ چھتہ بعض باتوں میں انسانی تمدن سے بھی زیادہ اعلیٰ معاشری کارنامہ ہے۔ کونن ڈائل نے سراغ رسانی کی کہانیوں میں ایک نئی روح پھونکی۔ آسکر وائلڈ نے فن کو محض حسنِ فن کے نقطۂ نظر سے دیکھا اور پیش کیا۔ برنارڈ شا نے جو یقیناً اس عہد کا سب سے مؤثر مصنف تھا معاشی اصلاح کا پھریرا اُڑایا اور کہا کہ اشتراکی بنو۔ بیری نے "بچپن کی طرف واپسی" کا نعرہ بلند کیا۔ ایبسن نے سمجھایا کہ "زندگی کا سامنا کرو"۔ نیٹشے نے مسیحیت کی غلام ذہنیت کا نقشہ کھینچا

---

[51] ANTHROPOLOGY

[52] EUGENICS

[53] PSYCHICAL RESEARCH

[54] TELEPATHY

غرض ان اور دیگر مختلف مصنفین کے پیغامات سننے اور ان پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کی یورپی علمی و ادبی تحریکات کا رخ زیادہ تر نفسیات اور خود فہمی ہی کی جانب تھا۔ لوگ کچھ نہ کچھ آگاہ ہو رہے تھے کہ ان کی زندگیوں اور حالات میں جو گڑبڑ ہو رہی ہے۔ وہ محض اپنے متعلق زیادہ آگاہ ہونے ہی سے دور ہو سکے گی۔ اور اگر وہ نہیں چاہتے کہ ان کی زندگیاں بے سروپا حادثات کا نشانہ بنیں تو لازم ہے کہ وہ فطرت اور اس کی ضروریات سے کماحقہٗ واقفیت حاصل کریں۔ یوں علم ادب اور معاشرۃ دونوں ہاتھ میں ہاتھ دیئے ایک نامعلوم سرزمین کی طرف بسرعت گام زن ہو رہے تھے صرف انھیں اس بات کا دھندلا سا احساس ہو رہا تھا کہ کوئی شے انھیں کشاں کشاں بسرعت کہیں لئے جاتی ہے۔ اور کبھی کبھی یہ شک گزرتا تھا کہ وہ شے کوئی بیرونی وجود نہیں بلکہ ان کا اپنا ہی نفس ہے

نظری تفتیش کی بعض دریافتیں بظاہر محض نظری تھیں لیکن فی الاصل اساسی اور عمیق اور اس لئے بالآخر غایت درجہ اہم اور انقلاب انگیز ثابت ہوئیں۔ مادام کیوری نے ریڈیم کی دریافت سے طبیعیات کے اساسی مفروضات اور مادیت کے منجمد سے اعتقادات کی بنیاد ہلا دی۔ بور اور ٹامسن اور فورڈ نے جزو لایتجزیٰ (ایٹم) کے متعلق ثابت کر دکھایا کہ وہ بھی ایسا ہی کھوکھلا ہے جیسا کہ نظام شمسی۔ اُدھر آئن سٹائن ابھی دور ہی دور قدیم کائنات کو اپنے نفس کے عرق میں گھول کر اور کا اور بنا رہا تھا جس سے مستقبل قریب میں ایک علمی انقلاب عظیم واقع ہونے والا تھا۔ ارتقائے حیات کے متعلق ڈاروِن نے حیاتِ انسانی کو جس انفعالی حالت پر پہنچا دیا تھا مینڈل نے اسے اس ذلت سے نکالا اور بتایا کہ زندہ جرثومہ میں یہ طاقت موجود ہے کہ وہ خود بخود تبدیل ہو کر گویا پھلانگ کر ایک بالکل نئی جنس بن جائے۔ ڈاروِن نے زندگی سے از خود عمل کرنے کی جو قوت چھین لی تھی اور اسے حالات اور ماحول کے حوالے کر دیا تھا مینڈل نے اسے پھر بحال کر دیا۔ کیرل نے مرغی کے جسم کا ایک ٹکڑا علیحدہ کر کے اور زندہ رکھ کر ثابت کر دیا کہ کسی جاندار کی ایک زندہ رگ غیر معین وقت تک زندہ رکھی جا سکتی ہے۔ یہ ٹکڑا آج تک زندہ موجود ہے۔ ان عجیب و غریب مظاہرے نے زندگی کے متعلق انسانی علم میں حیرت انگیز اضافہ کر دیا۔

(رجحان)

اب ہمیں غور کرنا ہے کہ مندرجہ بالا واقعات و تحریکات کے نیچے اور اندر ہی اندر جبلی زندگی کی کونسی موج اور کونسا رجحان اس زمانے میں کام کر رہا تھا جو انسان کو اس کے نامعلوم ٹھکانے کی طرف لئے جا رہا تھا؟ "یہ تیز رو زمانہ" کے مصنف کو اس بات پر اصرار ہے کہ گزشتہ تینتیس سال انسانی تاریخ میں ایک انوکھی حیثیت رکھتے ہیں وہ کہتا ہے کہ تاریخ کبھی اپنے آپ کو دہرا نہیں سکتی کیونکہ تاریخ انسان کی مسلسل ارتقا کرنے والی روح کا محض عکس ہے۔ اور انسان ایک تبدیل پذیر حیوان ایک مخلوقِ بحرانی ہے۔ جو اپنے ماحول پر انحصار رکھنے کی حالت سے گزر کر اب بکمال سرعت اس بالکل دوسری حالت میں جا پہنچا ہے جہاں اسے اپنے ماحول پر پوری طاقت اور اس کا پورا اندازہ حاصل ہو رہا ہے۔ اس بیرونی اندازے سے گزر کر اب وہ اس اندازۂ نفس اور خود فہمی کی طرف گام زن ہے جہاں اسے یہ

TORBINE ؎

سمجھنا ہوگا کہ آیندہ میری ترقی تمام تر اپنے نفس کے اندر اور فقط اپنے ہی آپ میں ہوگی۔ پھر وہ وقت آئے گا کہ نوع انسان دیکھے گی
وہ کیا کچھ کر رہی ہے؟ اس انقلاب کے مقابلے میں دوسرے تمام انقلابات محض بچوں کا کھیل ہیں۔ اس وقت ہمیں فوری حیرت کا ایک صد
پہنچے گا اور ہم سمجھیں گے کہ ہم کیا کچھ کرتے رہے ہیں اور کیوں؟ پھر موجودہ نیم آگاہی کی حالت کا خاتمہ ہوجائے گا اور ہم کامل طور پر ارادہ کر
والے اور باشعور ہستی بن جائیں گے۔ لاتعداد صدیاں گزریں کہ ایک وہ ساعت تھی جب انسان انسان بنا۔ آج ایک ویسی ہی رفیع الشا
ساعت نوع انسان سے دوچار ہو رہی ہے اگر یہ نظریہ درست ہے تو پھر ہمارے اس زمانے کی خصوصیات اور اس انقلاب عظیم کی نشانیاں
روزمرہ کے عام کاموں اور باتوں میں روز روشن کی طرح نمایاں ہونی چاہئیں۔ آؤ دیکھیں کہ کیا ہمارے بظاہر غیر اہم کاموں میں بھی ان کا کو
نشان موجود ہے؟

فنون لطیفہ میں انیسویں صدی کے "اثر پسند"[1] فطرت کو زمانہ سے علیحدہ کرکے دیکھنے کے خواہاں تھے کہ وہ عین دیکھنے کی گھڑ
میں کیسی نظر آتی ہے؟ اب فرانسیسی نقاش سیزان CEZANNE نے اس سے آگے قدم بڑھایا۔ وہ دنیا کی اس "زندہ فوری تصویر" کو اس
مفہوم سے علیحدہ دیکھنے میں کوشاں رہا۔ یورپی نقاشی کا مدعا اب یہ قرار پایا کہ وہ بیرونی دنیا کے صاف وصریح اور بے معنی اثرات میں
بعض مخصوص نمونے چن کر مرتب کرے جو رنگ و وضع کی مدد سے بعض ایسی نسبتیں اور درجے ظاہر کریں جو ہمارے حسن کی چھپی ہوئی ت
حس کو بھلے معلوم ہوں۔ اس فطری رجحان کی مانی ہوئی مثال یہ ہے کہ اگر ایک خط مستقیم کو تقسیم کرنا ہو تو ہماری فطرت کا بلا وجہ خود بخود تقاضا
ہوگا کہ وہ اسے نصف میں نہیں بلکہ اس کی لمبائی کی دو تہائی پر جاکر تقسیم کرے۔ بعض ماہرین کا خیال ہے کہ دو تہائی نسبت کے متعلق یہ فطر
میلان انسانی جسم کی کی اپنی نسبت اور نمونے سے پیدا ہوتا ہے۔ علاوہ بریں بجائے نصف کے دو تہائی کی تقسیم بجائے تکمیل اور سیری اور سک
کے ایک نوع کی ناقیام پذیری اور عروج و کمال کی ممکنات کا احساس پیدا کرتی ہے جو انسان کے لئے دل خوش کن اور حیات افزا ثا
ہوتا ہے۔ آرٹ میں مکعبیت[2] اور انتہائی واقعیت[3] پسندی کی تحریکات اسی طرح پیدا ہوئیں۔ گو وہ پیدا ہوتے ہی جلد شکوک و اختلاف رائے
باعث فنا بھی ہوگئیں۔

لیکن فنون لطیفہ کو اس تمام دھندلے سے منظر میں دو تحریکات کا صاف اندازہ ہوسکتا ہے۔ ایک موضوعی تحریک ہے جس کی بنا پر نقاشو
اور ماہرین فن کو روز بروز اس امر کا یقین ہوتا جاتا ہے کہ اگر وہ حقیقی نقاش ہیں تو وہ کسی مقررہ علمی اصول کے پابند نہیں ہوسکتے۔ اس دریافت
نتائج نہ صرف ماہرین فن کے لئے بلکہ حصول تعلیم میں اور عام زندگی میں ہر خاص و عام کے لئے بغایت درجہ اہم ثابت ہوئے اور یہی
زمانے کی سب سے زبردست نفسیاتی دریافت ہے کہ تمام معیار اضافی ہیں اور ان میں سے کوئی بھی مطلق و قائم بالذات نہیں جس سے صاف ظ
نکلتا ہے کہ معیار انسان کے وضع کردہ ہیں اور اس لئے انسان معیاروں کا خادم نہیں بلکہ معیار انسان کے خادم ہیں۔ ہمارے زمانے

---

[1] IMPRESSIONIST
[2] CUBISM
[3] SURREALISM

دوسری نفسیاتی دریافت جس کا عکس آج کل کے آرٹ میں بھی صاف ظاہر ہے یہ ہے کہ ہم حقیقی دنیا کو بہت کم دیکھ سکتے ہیں بلکہ اپنے خیالات کی فریب دہی کے باعث ہم اب تک اس کی ظاہری صورت کو بھی ٹھیک ٹھیک نہیں دیکھ سکے۔ نقاشی ہمیں بتاتا ہے کہ ہم کبھی بلاواسطہ ادراک نہیں کرسکتے ہم کبھی اشیاء کا معنی سے قطعاً علیحدہ ہو کر نظارہ نہیں کرسکتے۔

فن تعمیر میں بھی فعلی تعمیر؎ کی نئی طرز سے ظاہر ہوا کہ اب اس فن میں ماہرین پرانے قواعد و اسناد سے روگردانی کرنا چاہتے ہیں لباس میں پہلے سے زیادہ آزادی برتی جانے لگی۔ مثلاً مغربی عورتوں کے لباس میں بجائے زیب و زینت کے آرام و آسائش کا زیادہ خیال کیا جانے لگا۔ اپنی جنس کے متعلق عورتوں کے خیالات میں جو تبدیلی واقع ہوئی تھی وہ اب ان کے لباس میں بھی رونما ہونے لگی۔

یہ اس زمانے کی خصوصیات کی چند نشانیاں تھیں۔ ان سے صاف طور پر عیاں تھا کہ زندگی کے مختلف شعبوں میں ایک روزافزوں بے چینی، ایک بے اعتباری نئے نئے تجربے کرنے کی ایک خواہش بڑھ رہی ہے جس سے ظاہر تھا کہ مختلف طبقوں اور خواص و عوام میں خود آگاہی اپنے زوروں پر ہے۔ ہر شے مشکوک نظر آنے لگی تھی نکتہ چینی دل میں گھر کرنے لگی تھی۔ یہ دیکھ کر سوائے جدت پسندوں کے ہر کسی کا دل خوف و غصہ سے بھر گیا۔ قدامت پرست۔ قومیت پرست۔ قوت پرست۔ مذہب پرست یہ سب نوع انسان کے اس رجحان پر چراغ پا ہو گئے۔ قدامت پسندوں نے جدت پسندوں کو طنزاً دعوت عمل دی لیکن بدقسمتی سے جدت پسند محض خیال پرست اور بے عمل نکلے۔ وہ زمانہ جلد آنے والا تھا اور آیا جب جدت پسندوں کا جنازہ نکلتے ہی فوجی قوم پرستوں اور انقلابی انتہا پسندوں نے اپنی اپنی تلواریں میان سے نکال لیں اور ہر ایک نے کہا کہ صحیح تمدن کی محافظ صرف ہماری جماعت ہے اور کسی دوسرے کو اس سے سروکار نہیں۔

کیا جدت پسندی اور قدامت پسندی ایک دوسرے کو سمجھ سکتی ہیں؟ کیا وہ مل جل کر متاع تمدن کو نوع انسان کے لئے حاصل کرسکتی اور قائم رکھ سکتی ہیں؟ یہ وہ سوال ہیں جن کا کوئی شخص آج جواب نہیں دے سکتا لیکن اگر ماضی و مستقبل ایک دوسرے کے سمجھنے سے قاصر رہیں گے تو پھر امن و امان کا اللہ ہی والی ہے۔ ہمارے زمانے کی تنہا امید اس کی روح مفاہمت میں مرکوز ہے۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ عقل و فہم پہلے بیرونی دنیا سے گزرتی ہے اور پھر انسانی نفس کے تاریک گوشوں کو روشن کرتی ہے۔ اگر وہ وقت پر یہاں آ پہنچے گی تو ہم قوت و تشدد کی اس اندھا دھند کل کو اپنا خونی کام کرنے سے روک سکیں گے جو ہمیں تباہی کی طرف لے جا رہی ہے لیکن اگر اس کے آنے میں تاخیر ہوگی تو بس پھر ہم ہوں گے اور ہلاکت کے ہولناک غار ہمارے سامنے یہ آگاہی کے لئے ایک دوڑ ہو رہی ہے۔ اور اس کی رفتار اسقدر تیز ہے کہ انہیں بیس پچیس سالوں میں جو ہماری نسل کے لئے باقی رہ گئے ہیں اس کا فیصلہ یا ادھر یا ادھر ہو کر رہے گا!

FUNCTIONAL ARCHITECTURE ؎

حصّہ دوم

۱۹۱۰ء تا ۱۹۱۹ء

بیرونی منظر

یہ زمانہ جنگِ عظیم کی تیاریوں اور تباہ کاریوں کا زمانہ ہے۔

جیسا ہم دیکھ آئے ہیں جدّت پسند باوجود اپنی نام نہاد حریت پسندی کے محض شاہنشاہی اقتدار کے قیام کے نام لیوا بنتے چلے گئے ۱۹۱۰ء میں وہ ہنوز انگلستان میں برسرِ حکومت تھے لیکن صرف اپنے آئرش مددگاروں کے ذریعے سے۔ یہ ضرور ہوا کہ لائڈ جارج نے اپنے قومی صحت کے بیمے کے قانون سے غریب مزدوروں کی امداد کی اور ۱۹۱۱ء میں پارلیمنٹ ایکٹ کی وجہ سے دارالعوام کو ہمیشہ کیلئے دارالامراء پر قانونی طور پر تفوق حاصل ہو گیا لیکن اُدھر "حقوق طلب" عورتوں نے امن پسندوں کا ناک میں دم کر دیا اور اِدھر قدامت پسندوں نے جو آخری آویزش کے لیے اپنی آستینیں چڑھا رہے تھے۔ آئرستان میں باغی السٹر کے سرکردہ کارسن کی پیٹھ ٹھونکی جس نے دنیا کو کچھ عرصہ ایک چھوٹے پیمانے پر "اختیارِ مطلق"[1] کا تماشہ دکھا دیا۔

جدّت و قدامت میں یہ کشمکش جاری تھی لیکن اس کی اس ہولناک جنگ کے آگے کیا حقیقت تھی جو کچھ عرصہ کے لئے اس بے معنی غل کو توپوں کے شور و غوغا میں گم کر دینے والی تھی۔ یہ کشمکش یورپ کو اسی زلزلے کی طرف لے جا رہی تھی۔ انگلستان اور جرمنی میں بحری قوت کا مقابلہ بڑی شد و مد سے شروع ہو گیا اور فریقین جہازوں کی تعمیر پر اپنا سارا اندوختہ صرف کرنے لگے۔ سوال اب یہ نہ تھا کہ کیا جنگ ہوگی؟ بلکہ یہ کہ وہ کیا ہوگی؟ کچھ مدت سے فرانس اور روس باہم حلیف تھے اور ادھر جرمنی اور آسٹریا۔ اور بظاہر اطالیہ بھی ان کے ساتھ تھا۔ اب اہم مسئلہ انگلستان کی دوستی حاصل کرنے کا تھا اور انگلستان باوجود اپنی علیحدگی کے فرانس کی طرف مائل تھا۔ ۱۹۱۱ء میں اطالیہ نے بغیر لڑائی چھڑے ترکوں کے طرابلس پر ہاتھ صاف کیا۔ ۱۹۱۲ء میں بلقانی ملکوں نے مل کر ترکی پر حملہ کیا۔ اور یورپ میں ترکی سلطنت کا تقریباً خاتمہ کر دیا صرف انور پاشا کی ہمت نے قسطنطنیہ اور اڈریانوپل کو ۱۹۱۳ء میں بچا لیا۔ دول یورپ مسکراتی ہیں لیکن مسکرانے کے اب تھوڑے ہی دن باقی تھے ان کی باری بھی آ رہی تھی اور بہت جلد۔

۲۸ جون ۱۹۱۴ء کو سرویا والوں نے آسٹری ولی عہد کو قتل کر دیا۔ آسٹریا نے الٹی میٹم دے دیا اور سخت شرائط پیش کیں۔ انگلستان اور جرمنی نے کہا کہ یہ محض ایک بلقانی معاملہ ہے انصاف سے طے ہو جائے۔ اس میں زار روس نے بھی قیصر سے اتفاق کیا لیکن زار کے وزرا جو روس کی اندرونی شورشوں کو بیرونی جنگ سے دبا دینا چاہتے تھے۔ یہ اچھا موقع پا کر سرویا کی امداد کو اٹھ کھڑے ہوئے۔ فوج کی تیاری کا جلد جلد سامان ہونے لگا۔ قیصر نے زار کو تار بھیجا کہ ان تمام تیاریوں کے کیا معنی ہیں؟ لیکن اب الفاظ و معانی کا زمانہ گزر چکا تھا۔ اُدھر روس کی فوج

---

[1] DICTATORSHIP

تیار ہوئی۔ ادھر جرمنی کی۔ جرمنی نے یکم اگست کو جنگ کا اعلان کیا اور بلجیم میں سے ہوتا ہوا روس کے حلیف فرانس کی طرف بڑھا۔ ۴ اگست کو انگلستان نے بھی جرمنی سے لڑائی کی ٹھانی۔ یوں یہ مہذب "دور اندیش" لوگ ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو گئے!

سیاسی اور حربی دونوں حیثیتوں سے جنگ عظیم تین حصوں میں منقسم ہو سکتی ہے۔ سیاسی طور پر جنگ کا پہلا دور تقریر و بلاغت کا دور تھا جدت پسند سیاست دانوں نے کہا یہ جنگ بلجیم کی آبرو کے لئے ہے۔ فرانسیسیوں نے کہا اس سے السَّاس۔ لورین کے غصب شدہ علاقے ملینگے اور جرمن خطرے سے رہائی حاصل ہو گی۔ روسیوں نے سوچا کہ ہم قسطنطنیہ کو دبوچ لیں گے۔ اور اپنے ملک کی انقلابی تحریک کو ملیامیٹ کر سکینگے جدت پسند جرمنوں نے خیال کیا کہ اس سے روسی خطرہ رفع دفع ہو گا۔ اور جنگ پسند جرمنوں نے کہا کہ جنگ سے ادھر ہم اپنے ملک میں طاقتور ہو جائینگے ادھر ساری دنیا میں سب پر غلبہ پالیں گے۔ جنگ کا دوسرا سیاسی دور خفیہ معاہدوں کا دور تھا۔ اتحادیوں نے دیکھا کہ محض جوش و خروش اور تقریروں یا تحریروں سے یہ جنگ نہ جیتی جائے گی سیاسی جوڑ توڑ لازم ہے۔ اطالیہ چپ بیٹھا تھا۔ اس سے سلسلہ جنبانی شروع ہوئی تم کیا لوگے؟ تم کیا دوگے؟ اندر ہی اندر معاملہ طے ہو گیا مئی ۱۹۱۵ء میں اطالیہ اتحادیوں کے ساتھ شامل ہو گیا لیکن اس شمول سے جرمنی پر کچھ بھی اثر نہ پڑا جنگ بدستور جاری رہی کئی مہینے گزرتے گئے۔ کیا اسی طرح برس بھی گزرتے جائیں گے؟ کچھ اور کرنا کرانا لازم ہو گیا۔ اسی لئے تیسرا سیاسی دور نشر و اشاعت کا دور تھا۔ جنگ کی طوالت سے فرانس اور انگلستان بے جان سے ہو گئے تھے جرمن آب دوز کشتیوں اور ہوائی جہازوں کے حملوں نے عوام کے جوش کو ٹھنڈا کر دیا تھا۔ انھیں تازہ دم کرنا۔ اور اکسانا ابھارنا ضروری ہو گیا چنانچہ نظارتِ طبع کے ذریعے سے صرف ایسی خبروں کی اشاعت کی اجازت ملنے لگی جو خشک صداقت کا پہلو چھوڑ کر قومی ارادوں کی مضبوطی کا ذریعہ بن سکیں اب لوگ اصلی واقعات سے بے خبر رہنے لگے ان کی حکومتیں انھیں جو چاہتی تھیں بتاتی اور جو چاہتی تھیں ان سے چھپاتی تھیں یعنی جھوٹ سچ کی ملی جلی معجون سے بیمار قوموں کی طاقت کو مصنوعی طور پر اکسایا اور ابھارا جا رہا تھا کیونکہ یہ بات سب کے ذہن نشین ہو چکی تھی کہ یہ جنگ صرف توپوں اور گولوں اور گیسوں سے نہ جیتی جائے گی بلکہ جوش غصہ طیش۔ بدزبانی لعن طعن یہ اس تہذیبی جنگ میں کارآمد حلیف ثابت ہوں گے۔

حربی حیثیت سے بھی جنگ عظیم کے تین الگ الگ دور ہیں پہلا تیز رو جنگ کا دور جو کہ جیسا جرمنوں کا خیال تھا صرف چند ہفتے جاری رہا جرمن فوجیں ایک تند طوفان کی طرح پیرس پر ٹوٹ پڑیں لیکن عین قریب آ کر انھیں جلد ہی لوٹ جانا پڑا۔ دوسرا دور مقاماتی[1] جنگ کا دور تھا جس میں ہر مقام کے لئے بلکہ ذرا ذرا سی زمین کے لیے اتنا سامان حرب اور اتنے جنگ جو برسرِپیکار ہوتے تھے اور قومیں چند کھیتوں کے حصول کے لئے اتنا اتنا مال متاع اور اس قدر قیمتی خون بہا دیتی تھیں کہ اس سے قبل کی بڑی بڑی جنگوں میں اتنے صرف سے ملکوں کی قسمت طے ہو جایا کرتی تھی۔ کہنے کو یہ جنگ مختلف مقامات کے حصول کی خاطر ہوتی تھی لیکن اصل یہ ہے کہ یہ محض موجودہ حربی کل کی بے کاری کا ایک مظاہرہ تھا۔ روز و شب طرفین ایک دوسرے پر گولے برساتے تھے۔ گیسیں انڈیلتے تھے بم پھینکتے تھے لیکن بے سود۔ دوسروں کو مارتے تھے۔ آپ مرتے تھے لیکن یہ سب قتل و خون لاحاصل ہوتا تھا مہینوں بلکہ برسوں وہی خندقیں ہوتی تھیں اور اسی ملک کے جنگ جو

---

[1] WAR OF POSITIONS

جانوروں کی طرح ان خندقوں میں اسیر رہتے تھے جنگ کا تیسرا اور آخری حربی دور ماہرین میکانیت و کیمیا کی ایجادوں مثلاً بڑے بڑے شہروں پر ہوائی تاخت کے عمل کا زمانہ تھا۔ یہ طرز جنگ ابھی تھوڑا ہی عرصہ جاری رہی تھی کہ جنگ کا فیصلہ ان اتحادی جنگ جوؤں کے حق میں ہو گیا جو میدان جنگ میں لڑ کر کامیاب نہ ہو سکے تھے لیکن جن کی متفقہ صنعت نے اب زمینی و ہوائی جنگ میں بوجہ اپنی مسلسل میکانی فوقیت کے کامیابی حاصل کر لی

پہلے پہل جرمن پیرس پر جھپٹے اور اتحادی بھاگے جرمن اس قدر تیزی سے بڑھے کہ محض گویا اپنی قوت کے زور میں آگے کو جا پڑے۔ اُلٹے لوٹے اور ذرا ہٹ کر ٹھہرے اور پھر خندقیں کھود کر بیٹھ گئے۔ اُدھر روسی مشرقی پرشیا میں گھس آئے لیکن وہاں ہنڈن برگ کی حیرت انگیز جنگی حکمت عملی نے آن کی آن میں اُن کا قلع قمع کر دیا۔ پھر بالخصوص مغربی محاذ پر ایک بڑی غیر دلچسپ مہینوں بلکہ سالوں کی اندھی سی جنگ شروع ہوئی گولہ باری ہو رہی ہے بم پھٹ رہے ہیں۔ اِدھر یہ اُدھر وہ اپنی اپنی خندقوں میں بیٹھے ہیں۔ یا بارش اور طوفان ہے اور برف باری ہو رہی ہے۔ یا سورج خاموشی سے چمکتا ہے یعنی صبح ہوتی شام ہوتی ہے اور یہ جنگ برابر یوں ہی جاری رہتی ہے۔ نہ غنیم کی شکل دکھائی دیتی ہے نہ فوجوں کا کھلم کھلا سامنا ہے۔ سپاہی تو سپاہی قائدوں اور سرداروں تک کو علم نہیں کہ محاذ جنگ پر سب جگہ کیا کچھ ہو رہا ہے۔ ایک عظیم الشان شیطان کی آنت کی طرح لمبی چوڑی شے ہے جس کے ساتھ اوپر نیچے اِدھر اُدھر سب چمٹے ہوئے ہیں۔ ایک دوسرے کو چھپ چھپ کر دیکھتے ہیں۔ مارتے پیٹتے ہیں اور پھر اپنے اپنے بلوں میں جا گھستے ہیں جیسا جنرل فلے نے کہا یہ سارا عمل اس قدر جاہلانہ تھا کہ اسے محض دیوانہ پن کہا جا سکتا ہے جنگ اب وہ پہلے کی سی ایک شان دار کھیل نہ رہی تھی بجز نے جھنجھلا کر کہا یہ جنگ نہیں ہے لیکن خواہ کچھ کہتے اور کچھ کرتے تھے یہ جنگ تھی لیکن ایک نئی طرح کی غیر دلچسپ ظالمانہ لغو غیر علمی حیوانی جنگ۔ خون چوسنے والی دل و دماغ کو ہلانے اور اعصاب کو بیکار کر دینے والی جنگ جس میں یونہی لڑنا اور یوں ہی سسک سسک کر جان دینا تھا۔ تمدن کا تاوان یونہی ادا ہونا تھا!

بحری جنگ میں بھی پہلے ذرا سی پرانے طرز کی کھلی لڑائی ہوئی لیکن جلد ہی سمندر پر بھی ویسی ہی خاموشی چھا گئی جیسی زمین پر طاری تھی جرمنی کی آب دوز کشتیوں نے نیچے ہی نیچے گولے چلانے شروع کئے پھر بارود کی کانیں" سمندروں میں لٹکا دی گئیں کہ جہاں کوئی ناآشنا جہاز آیا۔ اور اس کا خاتمہ ہوا۔ انگریزی عظیم الجثہ بحری بیڑے نے جرمن بیڑے کو اس کے بندرگاہوں میں بند کر دیا لیکن اُدھر اسے خود بھی اپنے ملک کی دور دراز خلیجوں میں محبوس ہونا پڑا۔ بحری جنگ بھی خاموشیوں اور نامعلوم خطروں اور خوفناک بھول بھلیوں کی جنگ بن کر رہ گئی۔

تین سال تک کبھی اِنھوں نے کبھی اُنھوں نے جارحانہ کارروائی کی ٹھانی۔ گولہ باریاں کیں بم پھینکے تباہ کیا لیکن خود بھی تباہ ہوئے اور منہ کی کھائی اور نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔ ۱۹۱۵ء آیا۔ انگلستان والوں کی پکار تھی کہ گولے بناؤ اور گولے جرمنوں نے بلجیم میں ایپرے میں اتحادیوں کو اپنی نئی گیس کا مزا چکھایا۔ اتحادی محاذ متزلزل ہوا لیکن خود جرمنوں کو خیال نہ تھا کہ یہ نیا ہتھیار اتنا کامیاب ہوگا سو اس کامیابی سے زیادہ فائدہ نہ اٹھایا جا سکا۔ اتحادی پہلے چیخے چلائے کہ یہ ظلم ہے۔ وحشیانہ ظلم لیکن جب انھوں نے بھی اس ظلم کی کل کا بھید پا لیا تو وہ بھی اسے ویسے ہی

بڑھنے لگے۔ جرمنوں نے آب دوز کشتیوں اور زیپلن جہازوں سے جابجا تباہی پھیلائی۔ انگریز دردانیال کی تسخیر کو چلے۔ لیکن یہاں بھی ظاہر ہوگیا کہ موجودہ جنگ میں ایک ہوشیار غنیم کے لئے مدافعانہ جنگ اسی قدر آسان اور کارآمد ہے جس قدر اس کے حریف کے لئے جارحانہ لڑائی خونریز اور بے سود ہے۔ جیسا اوپر بیان ہو چکا ہے اطالیہ مئی ۱۹۱۵ء میں اتحادیوں کے ساتھ آملا۔ لیکن زبردست جرمن کے کان پر جوں بھی نہ رینگی۔ اتحادی بار بار حملے کرتے اور تباہ ہوتے رہے اور یہ امر اب ثابت ہو چکا ہے کہ اگر دو سال بعد امریکی آ کر جال و مال سے ان کی مدد نہ کرتے تو اتحادی تھک ہار کر جرمنی کے سامنے ہتھیار ڈال دینے پر مجبور ہو جاتے۔ ۱۹۱۶ء میں وردون کے مستحکم ترین مقام پر گولہ باری کی تباہ کاریاں نظر آئیں جہاں ساڑھے تین لاکھ فرانسیسی کام آئے اور پانچ لاکھ جرمن اور ظاہر ہو گیا کہ پرانی طرز کی جنگ کا اختتام ہو چکا ہے اور دوسرے یک بیک چھاپہ مارنے کا حربہ بھی اب استعمال میں نہیں آسکتا۔ ہوائی جہاز اور آبدوزیں اور آگاہی کا کوئی جواب نہ تھا اسی سال مئی میں جٹلینڈ کی بحری جنگ ہوئی جس کے فائدے جرمنی کے لئے بہت ہیں لیکن اس جیسی پھیلائی عالمگیر جنگ میں عارضی فائدے محض بے فائدہ تھے۔ یہ بھی درست تھا کہ روس کی سانس پھول رہی تھی۔ لیکن ادھر آسٹریا کا حال بھی پتلا ہو رہا تھا۔ اور اتحادی بھی گاہے گاہے اپنے وار چلاتے تھے۔ چنانچہ دریائے سوم پر انگریزی فوج بڑھی لیکن پونے پانچ لاکھ سپاہی کھو کر واپس لوٹی۔ اتحادی اپنے نو ایجاد "ٹینک" (متحرک آہنی حوض) لے کر نکلے۔ جرمن صفیں درہم برہم ہوئیں لیکن جیسا اس جنگ کے بعض اور نئے اسلحہ کے استعمال کا نتیجہ ہوا۔ ویسا ہی ٹینکوں کا نتیجہ ہوا یعنی کامیابی اتنی زیادہ اور اتنی غیر متوقع تھی کہ خود موجد وقت پر اس سے فائدہ نہ اٹھا سکے بھید کھل گیا اور جب دوبارہ ان کا استعمال ہونے لگا تو علاقہ فلانڈرز نے کیچڑ سے غنیم کی مدد کی۔ اب یہ جنگ اتنی طویل ہو رہی تھی کہ اہل انگلستان بھی اپنے الگ تھلگ جزیرے میں بیٹھے روز و شب اس کا دباؤ بیش از بیش محسوس کرنے لگے۔ طیاروں کی ہوائی تاخت آب دوزوں کی بحری تاراج۔ خوراک کی بڑھتی ہوئی کمی۔ فوجی بھرتی کا زور۔ ان سب کا الگ الگ اور مجموعی اثر پڑ رہا تھا سو اب نشر و اشاعت اور جھوٹے سچے اعلانوں کا وقت آیا۔ قوم کو وعدے دے دلا کر اور کامرانی کے سبز باغ دکھا کر ابھارا گیا۔ یہ زمانہ بڑی سختی کا زمانہ تھا۔ ترکی کی وسیع کمزور سلطنت پر بھی کوئی کامیاب حملہ نہ ہو سکا۔ سرویہ پست ہو چکا تھا۔ رومانیہ بھی جسے ۱۹۱۶ء میں اتحادیوں نے کھینچ گھسیٹ کر اپنے ساتھ شامل کر لیا تھا پسپا ہو چکا تھا اور دنیا پر ان جرمن فتوحات کا خاصہ اثر ہو رہا تھا۔ یہ حالت تھی کہ امریکہ میدان جنگ میں داخل ہوا در اصل امریکہ برضائے خود جنگ میں شریک نہ ہوا بلکہ جرمنی کی تنگ کرنے والی آبدوزی جنگ نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ اتحادیوں کا ساتھ دے فروری ۱۹۱۷ء میں جرمنی نے اعلان کر دیا کہ اس کا ارادہ ہر ممکن ذریعے سے بحری آمد و رفت کا سد باب کرنا ہے بحری دشمنوں میں رکاوٹیں پیدا کر دی گئیں خشکی پر ایک زبردست مدافعت کا سامان کیا گیا اور وہ عظیم الشان ہنڈن برگ محاذ قائم ہوا جو دیوار چین کے بعد دنیا کی سب سے بڑی سد راہ کہی جا سکتی ہے۔ ادھر روس جہاں زارینہ کے مشیر اعظم روحانی بدکار رسپوٹین کے قتل کے ساتھ ہی گویا زاریت کا خاتمہ ہو گیا اور جہاں جرمنی کی چال بازی سے لینن چپکے سے اپنی اشتمالیت لے کر گھس آیا تھا جنگ سے دست کش ہو گیا۔ اس سے جنگ تقریباً ایک سال اور طول کھینچ گئی جرمنوں نے برسٹ لٹوسک کے معاہدے سے روس کو زیر نگیں کیا۔ لیکن اتنی سخت شرائط پیش کرنے اور اپنا لوہا منوا لینے میں

اپنی کوتاہ اندیشی کا ثبوت دیا ادھر امریکی صدر جمہوریہ ولسن نے فروری ۱۹۱۸ء میں اپنی چودہ شرائط کے اعلان سے دنیا کو اپنی جدت پسندی اور حریت نوازی کا روشن ثبوت دے کر اتحادی نشر و اشاعت پر کامیابی کی مہر ثبت کر دی غلام قوموں کو آزادی کا وعدہ ملا آزاد قوموں کو مساوات و اخوت کا سبق دیا گیا اور ساری نوعِ انسان کو ایک نورانی مستقبل کی جھلکی دکھائی گئی۔ ادھر جرمنوں نے آخری جارحانہ پیشقدمی پر کمر باندھی اتحادی پسپا ہوئے ان کا محاذ کچھ متزلزل ہوا لیکن جرمن اپنی تیز پیش قدمی سے کماحقہٗ فائدہ نہ اٹھا سکے اتحادی ڈٹ گئے اور سب کی سب اتحادی فوجیں فرانسیسی جنرل فوش کے تحت میں کر دی گئیں تاکہ یک جہتی قائم رہے ادھر جرمنی خانوں میں اشتمالیت کی اور سرمایہ داری پر ٹیکس کی تجویز ہوئی بلکہ حالت اتنی نازک سمجھی گئی کہ خوراک کی کفایت کے لئے کتوں کو ہلاک کر دینے تک کی تجاویز پیش کی گئیں عورتوں نے صدائے احتجاج بلند کی اور اپنے چہیتے کتوں کو بچا لیا۔ ایک نسوانی لیڈر نے کہا۔ ہم حکومت کو بتا دینا چاہتے ہیں کہ کتے ووٹ ہیں لیکن ادھر جرمنی کی طاقت آخر کار روز بروز کم ہو رہی تھی اور اتحادیوں کی متفقہ دولت و قوت اور متحدہ تنظیم آخر اپنا اثر پیدا کرنے لگی تھی جب آخری جرمن حملہ ناکامی میں ختم ہوا تو اتحادیوں نے یکبارگی آگے کو قدم بڑھایا جرمن فوجیں برابر پسپا ہوتی گئیں اب وہ اتحادیوں کے مقابلے میں تعداد میں کم تھیں ان کے پاس ٹینک کم تھے ہوائی جہاز کم تھے خوراک کم تھی غرض ہر شے کی کمی تھی۔ ستمبر کے آخر میں بلغاریہ نے ہتھیار ڈال دئے ایک ماہ کے بعد ترکی نے اس کے بعد آسٹریا کا خاتمہ ہوا بیلجیم کا ساحل غنیم کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ جرمن شہروں پر بم پھینکے گئے اور جرمنی نے ہنگامی صلح کی درخواست کر دی فرانسیسیوں نے اس ڈر سے کہ جنگ کے طول کھینچنے سے امریکہ کا رعب روز بروز بڑھے گا۔ فوراً یہ صلح منظور کر لی اس وقت جرمنی کی حالت زار و نزار ہو رہی تھی جرمن سپہ سالار لیوڈنڈورف[۱] سویڈن کی طرف بھاگ نکلا۔ بحری قائد ٹرپٹز[۲] بھی اپنی ڈاڑھی منڈوا کر روپوش ہو گیا۔ بحری تاجر قیصر کے دوست بیلن[۳] نے اپنے دفتر میں بند ہو کر اپنے آپ کو گولی سے ہلاک کر دیا خود قیصر تخت سے دست بردار ہو کر ہالینڈ میں جا چھپا صرف ہنڈن برگ جرمن فوجوں کو خوش اسلوبی سے غیر مسلح اور منتشر کر کے بڑے اطمینان و خاموشی سے ہینوور میں اپنے چھوٹے سے گھر میں جا کر بیٹھ گیا جمہوریت پسند جرمنی ابھی اس کے اس صبر و استقلال کو نہ بھولا۔ ادھر اتحادی مسرت و انبساط کے نعرے بلند کرتے گھروں کو لوٹے لندن ذرا خاموش ضرور تھا لیکن حضرت لائڈ جارج اپنا قلم پکڑے یورپ کا بوسیدہ نقشہ سامنے رکھے تعلیں بجا رہے تھے کہ اب میں نئے جغرافیے کی جیسے چاہوں گا طرح ڈالوں گا۔ پیرس خوشی کی رنگ رلیوں میں غرق تھا۔ اور وہاں تین اتحادی مدبر یعنی برطانوی بطلِ اعظم لائڈ جارج اور فرانسیسی کلیمانسو جرمنوں کی دشمنی کے نشے میں چور اور امریکی خیر پرست "خدا و خلق کا خادم" صدر ولسن اپنی انجمن صلح قائم کئے ہوئے میٹھے سیاسی جوڑ توڑ کر رہے تھے۔ بیچارے لیگ پرست ولسن کی نیک مزاجی کی ہنسی اڑ رہی تھی کلیمانسو نے طنزاً کہا "یہ تو یسوع مسیح کی طرح گفتگو کرتے ہیں" غرض لائڈ جارج اور کلیمانسو نے اس غریب کو کٹھ پتلی کی طرح نچایا اور جو چاہا کیا۔ جرمنوں نے طوعاً و کرہاً ورسائی کے معاہدہ پر دستخط ثبت کر دیے لیکن اتحادی انصاف کا یہ عظیم الشان مسودہ "دائمی" امن کا ضامن ثابت نہ ہو سکتا تھا نہ ہوا۔ انسانی جہل و خونریزی کا لیمانہ اس لغو و بے معنی یادداشت کے ساتھ ختم ہوتا ہے جس نے بالآخر حریت پسندی و جدت طرازی کی

BALLIN ؎۳ TIRPITZ ؎۲ LUDENDORF ؎۱

رہی سہی آبرو بھی قطعاً کھو دی۔ ولسن اپنا بستہ لے کر امریکہ کو سدھارا اور اس کے ہموطنوں نے معاہدے کی طرف سے منہ پھیر لیا لائڈ جارج لندن میں کچھ عرصہ تن تنہا ڈینگیں مارتا رہا۔ جرمنی کے پاؤں میں بیڑیاں پڑی تھیں۔ روس دم توڑ رہا تھا۔ اور حضرت لینن اس کے سر پر بیٹھے اپنی اپنی تجاویز کا منتر پڑھ رہے تھے۔ باقی ماندہ دنیا فقط تباہ شدہ یورپ کو کن انکھیوں سے تک رہی تھی کہ دیکھیں اس نیم مردہ زخمی مریض کے بدن میں پھر ایک رعشہ سا اٹھتا ہے یا کب وہ یوں ہی سسک سسک کر جان دے دیتا ہے؟

پس منظری قوتیں

مزدوروں کی تحریک اب کوئی مستور قوت نہ تھی۔ انجمن مزدوران ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۰ء تک برسرِ اقتدار ہونے والی تھی لیکن ۱۹۱۰ء سے ۱۹۲۰ء تک اس کی ماہیت اور خیالات اور لائحۂ عمل بروئے کار آ چکے تھے۔ وہ حب الوطنی عقلیت پرستی اور اخلاق پسندی کی نام لیوا تھی اور اسی لئے وہ محض ماضی کی ایک یادگار بننے والی تھی نہ کہ مستقبل کی علمبردار۔

نسوانی تحریک بھی کامیاب ہو کر گویا ختم ہو چکی تھی۔ تاہم در اصل اس تحریک کا خاتمہ بالخیر اس وقت تک نہ ہو سکتا تھا جب تک یہ سوال پیش ہو کر طے نہ ہو جائے کہ کیا مرد اور عورتیں برابر ہیں اور اگر برابر نہیں تو کیا ایک جنس ہمیشہ دوسری پر جبر کرتی رہے گی اور کیا جنسیت اسی قدر اہم ہے جتنی سمجھی گئی ہے؟ یہ مسائل محض نسوانی حق رائے دہی سے متعلق نہ تھے۔ رائے دہی کی تحریک تو جنگ کے شور و غل میں تقریباً گم ہو گئی تھی لیکن یہ مسائل اس سے بہت زیادہ وسیع اور بہت زیادہ اہم تھے اور ان کی مختلف شقوں کا زندگی کے مختلف شعبوں میں بہت اثر پڑا۔

طب اور حفظانِ صحت کے محکمے بھی زمانۂ جنگ میں گویا بند رہے۔ ذوق کے نئے سوئٹزرلینڈی فطری علاج سے جس کے ذریعے دھوپ اور ہوا میں تقریباً برہنہ رہ کر مریض پہلوان بن سکتے تھے اس خیال کو اور تقویت پہنچی کہ انسانی صحت عام جسمانی طاقت پر منحصر ہے اور امراض کا علاج بالعموم اسی عام اصلاح کے ذریعے سے کرنا چاہئے۔ جنگی مجروحین میں ان لوگوں کا علاج جو گولہ باری کے دھماکے سے مخبوط الحواس ہو گئے تھے نفسیاتی تجزیے کے ذریعے سے کیا گیا جس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ نفس و جسم کس طرح باہم مربوط ہیں اور ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کئے جا سکتے۔

دریافتوں کے ضمن میں دسمبر ۱۹۱۱ء میں امنڈسن نے قطب جنوبی کو دریافت کیا۔

نئے خیالات کے سلسلہ میں فرائڈ کا نظریہ کہ جنسیت زندگی کی قوتوں میں سب سے زیادہ طاقت اور قوت ہے مقبولِ خاص و عام ہونے لگا لیکن جنگ کے ان نفسیاتی تجربات سے جن کا اوپر ذکر ہوا ہے یہ بھی ظاہر ہوا کہ ذہنی تخریب میں خوف کا بھی اتنا ہی اثر ہو سکتا ہے جتنا مجبور جنسیت کا۔ فرائڈ نے جنگ سے پہلے جنسیت کو ماہرینِ نفسیات کے لئے ایک نہایت عام اور مقبول مسئلہ بنا رہا تھا جنگ نے اگر جنسیت کے متعلق خاموشی کے توڑ دینے میں اور بھی مدد دی۔ فوجوں میں امراضِ پوشیدہ کے انسداد کے لئے ضرورت پڑی کہ جنگ جوؤں کو ان کے من [illegible] سے بخوبی آگاہ کیا جائے اور ایک بار جب جنسیت کا ذکر ممنوع نہ رہا تو ہر طرف اس کا چرچا ہونے لگا اور "پاک بازوں" کی ہنسی اڑنے لگی۔

۱۹۱۲ء میں کتی فوج کے بانی ولیم بوتھ نے انتقال کیا۔ اس کی تحریک روحانی نجات کی بجائے اب زیادہ معاشرتی اصلاح سے متعلق

ہوتی گئی۔

"روحانیت" کی نئی تحریک جنگ کی وجہ سے کچھ عرصہ پھلی پھولی۔ بہت لوگ بہت سے نوجوان مر مٹ گئے تھے اور ان کے عزیزوں کو ان سے بات چیت کر سکنا بہت مرغوب تھا جنگ کے بعد بھی "بقا بعد الموت" کے خیال کا کچھ اثر باقی رہ گیا "مسیحی حکمت" خسارے میں رہی لیکن روحانیت اور مسیحی حکمت دونوں کے متعلق اس خیال کا کچھ اثر باقی رہ گیا کہ بعض نئی انوکھی سی باتوں کا کچھ پتہ چلتا معلوم ہوتا ہے

عملی طبیعیات؎ نے طیاروں اور آب دوزوں کی رفتار و سود مندی اور گیسوں کی جنگ میں اپنے کارنامے پیش کئے۔

ادبیات میں نوجوانوں نے تحریر و طرز تحریر میں نئے نئے تجربے کرنے چاہے بعض نوجوانوں نے جنگ کے متعلق شاعری کی بعض نے محض لوگوں کو برافروختہ کرنے میں لطف اٹھایا۔ لیکن ویلز اور شا اور بینیٹ کے سوا باقی مصنفین کا ادب سب جنگی نشر و اشاعت تھا یا محض اشتہار بازی۔

نظری تفتیش؎ میں بعض نئی باتوں پر روشنی ڈالی گئی اہم دریافت یہ ہوئی کہ ایٹم (جز لا یتجزیٰ) کا ٹکڑے ٹکڑے ہونا ثابت ہو گیا۔ اس کی لطافت لا متناہی ثابت کی گئی۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں حیاتین (وٹامن) کا نظریہ ثابت ہوا جس سے اشیائے خوردنی کے خواص کے متعلق اس نئی بات کا انکشاف ہوا کہ غذا میں علاوہ ان کے ترکیبی اجزا کے ایک اور بالکل مستور سی شے وٹامن ہوتی ہے جو اس میں طاقت دہی اور صحت بخشی کی ایک خاص قوت پیدا کر دیتی ہے۔ غدود پر بھی نئی روشنی پڑی ایسی دریافتوں سے انسانی جسم کی ساخت کے زیادہ وسیع و منظم ہونے کا علم ہوا اور حکمت کو ترقی ہو گئی

اس زمانے کی بعض اور تحریکات کا مختصر ذکر مفید ہوگا جو بظاہر زیادہ اہم نہیں لیکن جو فی الحقیقت اس دور کے خصوصیات کی مظہر ہیں طرز تعمیر کی طرف توجہ کم تھی اس لئے بھی کہ نئے مکان متحرک یعنی موٹر کار کے نئے نئے نمونے نکل رہے تھے، ہاں امریکہ کے اونچے فلک بوس مکان اور اونچے ہوتے گئے اور وہیں سینما کی اس طاقت کی بنیادیں بھی استوار ہوئیں جو مستقبل قریب میں ہر کہ و مہ پر اپنا تسلط جمانے والی تھی لباس میں جنگی زمانہ نے کوئی خاص تبدیلی پیدا نہ کی۔ سوائے اس کے کہ مغربی عورتوں کا لباس زیادہ آزادانہ ہو گیا اور ان کے غرارے اتنے بلند ہوئے کہ ان پر جانگھیوں کا شبہ ہونے لگا۔

رجحان

اس زمانے کی سب سے گہری نیم شعوری تحریک وہ موج تھی جو فقط ایک جانب میں رواں نہ تھی بلکہ جو مختلف بلکہ متضاد جانبوں میں متحرک تھی۔ جنگ عظیم کے برپا ہونے میں ایک عنصر یہ احساس تھا کہ لوگ بہت نرم اور پھسپھسے ہو رہے ہیں اور جدت پسندی محض کام سے جی چرا رہی ہے اور یہ کہ سستی و سہل انگاری کو چھپانے کے لئے بڑے نفیس اور شیریں الفاظ کے پردے ڈالے جا رہے ہیں اور نوع انسان محض سختیوں اور تکلیفوں سے دور بھاگنا چاہتی ہے

؎ PURE RESEARCH ؎ APPLIED SCIENCE

سو جنگِ عظیم جب انسانی اور بین الاقوامیت کے خلاف ایک ردِّ عمل تھا لیکن جب جنگ آئی تو اس نے امن پسندوں سے لے کر جنگ پرستوں تک سب کو بیزار کر دیا اس پر پھر ایک ردِّ عمل ہوا تمدّن نے جو سمجھا تھا کہ اس طرح قوت کا آسانی حصول ہو جائے گا یہ خیال محض غلط نکلا نام نہاد انٹرنیشنل لاء جنگی قواعد اور قیدیوں کی نگہداشت اور غیر جانبداروں کی سود مند خدمت محض لاحاصل اور لغو ثابت ہوئی لوگوں نے جان لیا کہ ہم میں، بہت سے ظالمانہ و وحشیانہ ارادوں کو عمل میں لانے کی دراصل جرأت نہیں اور ایسی جنگ کو فقط وہی شخص جاری رکھ سکتے ہیں جنھیں یا تو معلوم نہ ہو کہ جنگ کی اصلیت کیا شے ہے یا پھر ایسے شخص جو اس قدر سخت دل ہوں کہ وہ تمدن کو تباہ و برباد کرنے میں لمحہ بھر کے لئے بھی تامل نہ کریں۔

اس لئے جب جنگ ختم ہوئی تو خیال ہوا کہ دنیا میں حبِّ انسانی کی پھر ایک لہر اٹھی لیکن دقت یہ تھی کہ اب بھی اس حبِّ انسانی کی مظہر صرف وہی جدت پسندی تھی جو اپنے آپ کو اس سے قبل عملاً بے عمل اور فضول ثابت کر چکی تھی جیسا کہ ہم دیکھیں گے کہ آئندہ دس سالوں کی داستان اسی کشمکش پر مشتمل ہے جس میں ادھر حبِّ انسانی ہمہ تن اس امر میں منہمک ہوئی کہ کس طرح اپنے خیالات کا اظہار کرے اور اپنے عمل کے لئے ایک نیا میدان تلاش کرے اور ادھر ردِّ عمل نے اپنی سر توڑ کوشش کی کہ وہ اس اظہار و عمل سے پہلے اس کا گلا گھونٹ کر رکھ دے۔

بہ تیز روزمانہ
سنہ ۱۹۰۰ تا سنہ ۱۹۳۳ء
نقشۂ واقعات

۱۹۰۰ء چین میں مکّہ بازوں کی بغاوت چین نے دول یورپ کے آگے سرِ تسلیم خم کیا

۱۹۰۱ء جنوبی افریقہ کی جنگ ۱۹۰۱ تا ۱۹۰۲

۱۹۰۲ء اتحادِ جاپان و انگلستان

۱۹۰۳ء انگلستان اور فرانس کے مابین ثالثی معاہدہ

۱۹۰۴ء جنگ روس و جاپان ۱۹۰۴ تا ۱۹۰۵

۱۹۰۵ء بنگال کی تقسیم

۱۹۰۶ء الجزیرہ کی کانفرنس۔ جرمنی کی پیش قدمی کا سدِباب۔

۱۹۰۷ روس اور انگلستان کا اپنے اپنے حلقہ ہائے اثر پر اتفاق رائے۔

۱۹۰۸ نوجوان ترکوں نے اپنا دستور اساسی پھر حاصل کیا۔ ایسکوئتھ انگلستان کا وزیر اعظم بنا۔ انگلستان نے اپنے بحری بیڑے میں اضافہ کیا۔

۱۹۰۹ لائڈ جارج نے اپنا "معاشرتی بیمہ" اسکیم پیش کیا

۱۹۱۰ ایسکوئتھ نے آئرش ارکانِ پارلیمنٹ کے ذریعے سے حکومت شروع کی۔ پرتگال میں جمہوریہ کا قیام

۱۹۱۱ اطالیہ نے طرابلس پر قبضہ کیا۔ "پارلیمنٹ کا قانون" نافذ ہوا۔

۱۹۱۲ جنگِ بلقان

۱۹۱۳ کارسن نے السٹر میں بغاوت کا جھنڈا بلند کیا۔

۱۹۱۴ جنگِ عظیم شروع ہوئی

۱۹۱۵ اطالیہ اتحادیوں کا حلیف بنا

۱۹۱۶ جنگِ وردان۔ بحری جنگ جٹلینڈ

۱۹۱۷ ممالک متحدہ امریکہ جنگ میں شریک ہوا۔ روس نے جرمنی سے صلح کر لی۔

۱۹۱۸ جرمنی نے ہتھیار ڈال دیئے، ولسن نے اپنی چودہ شرائط پیش کیں۔ معاہدۂ ورسائی۔

۱۹۱۹ کمال پاشا نے ترکی قوت کو منظم کیا۔

۱۹۲۰ جنگِ روس و پولستان

۱۹۲۱ مسولینی نے فاشیت کی بنا ڈالی۔ گاندھی کی طاقت رونما ہوئی۔

۱۹۲۲ یونانیوں کو ایشیائے کوچک سے نکالا گیا۔ معاہدۂ واشنگٹن۔ شہر روما میں مسولینی کا داخلہ

۱۹۲۳ ہسپانیہ میں اختیارِ مطلق۔ جاپان میں ہولناک زلزلہ

۱۹۲۴ انگلستان میں مزدوروں کی حکومت کا قیام

۱۹۲۵ لوکارنو کا عہدنامہ۔ ہنڈن برگ جرمن جمہوریہ کا صدر بنا۔

۱۹۲۶ انگلستان میں عام ہڑتال۔ کمال پاشا نے اپنی اصلاحات نافذ کیں۔

۱۹۲۷ روس نے اپنی "پنجسالہ تجویز" پر عمل شروع کیا۔ امان اللہ خاں نے افغانستان میں اپنی اصلاحات جاری کرنی چاہیں۔

۱۹۲۸ کیلگی معاہدہ

۱۹۲۹ معاشی کساد بازاری کا آغاز

۱۹۳۰ امریکہ میں بنکوں کا دیوالہ

۱۹۳۱ سٹیلن نے دوسری "جدید معاشی حکمت عملی" کا اعلان کیا۔ ہسپانیہ جمہوریہ بن گیا۔ "ویسٹ منسٹر کا قانون" منظور ہوا۔ انگلستان کی مالیات میں تزلزل۔

۱۹۳۲ جاپان نے منچوریا پر قبضہ کر لیا۔ جینوا میں تخفیف اسلحہ کی کانفرنس۔ جرمنی میں نازی کامیابیاں

۱۹۳۳ امریکی صدر جمہوریہ روزولٹ نے اپنی معاشی منصوبہ بندی کا تجربہ شروع کیا۔

بشیر احمد

مجھے جی لینے دو

مجھے جی لینے دو جتنا بھی جینا ہے مجھے، خون کی گرمی کے ساتھ، اور پھر مجھے مرجانے دو کسی محو خواب کی طرح شراب کے نشے میں مست!

مجھے نہ دیکھنے دو گارے کا بنا ہوا یہ روحانی مکان مٹی میں مٹی ہوتا ——— ایک خالی سی زیارت گاہ!

مجھے بسرعت جانے دو ایک بتی کی روشنی کی مانند۔ جو عین اپنے کمال نور کی گھڑی میں یک لخت گل ہو جائے!

نصف النہار دے دو مجھے ——— اور پھر بلا سے رات پڑ جانے دو!

بس میں چاہتا ہوں یوں جاؤں میں!

اور مجھ پر اتنی عنایت ہو کہ جب میں اس بھیانک شے کا سامنا کروں تو میرا گیت اپنی شورش میں گم کر دے دھندلے اندھیرے کو!

مجھے بن جانے دو ایک رنگینیوں سے کانپتا ہوا تار

جو بھرپور و شیریں ترین راگ سے معمور ہو ——— اور پھر ٹوٹ کر رہ جائے!

گلچیں

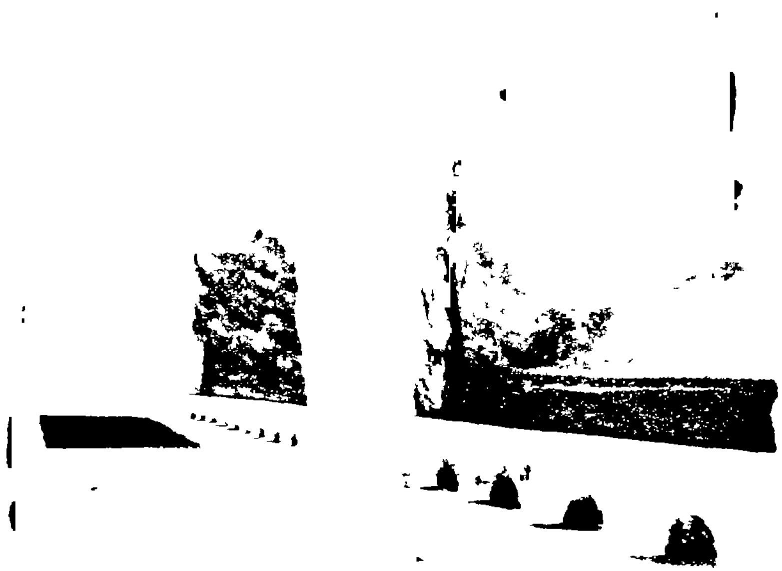
اے خوبصورتی!

اے خوبصورتی! کیا بات ہے تری!
یہ مخملیں پہاڑ یہ موہنا اُجاڑ
پھولوں کی ریل پیل چڑیوں کی کود کھیل
یہ دُھوپ یہ ہوا، یہ خُلد کی فضا
سب شان ہے تری اے خوبصورتی!

ننھی پھوار نے میٹھی سی بائے نے
دل کو جگا دیا کیسا مزا دیا
اس چھیڑ چھاڑ میں بوندوں کی آڑ میں







سوئٹزرلی ایک پہاڑی سڑک کا نظارہ

تو بھی چھپی ہوئی اے خوبصورتی!

دُنیا سے دُور ہوں محوِ سرور ہوں
اے لطفِ جانِ دل رُوحِ ویرانِ دل
آ اور مجھ سے مل آ اور مجھ سے مل
آ اور بن مری اے خوبصورتی!

جلوہ مجھے دکھا دل میں مرے سما
ہر چیز میں جھلک گہرائیوں تلک
دُنیا بنا اک اَور جس کا نیا ہو طور
اے میری نت نئی اے خوبصورتی!

بشیر احمد

پھوہڑ بیوی کی اکیاون (۵۱) لاکھ علامتیں

(۱) شوہر سے پیار کرتی ہے۔

(۲) شوہر کے علاوہ اور کسی مرد کا بھول کر بھی خیال نہیں کرتی۔

(۳) اگر کامل پھوہڑ نہ ہو تو غلطی نمبر ۲ کا احساس بہت دیر سے اسے ہوتا ہے۔ اور پھر فخریہ اس عیب کو یوں چھپاتی ہے" قسم لے لو جو ساری عمر آنکھ اٹھا کر کسی کو دیکھا ہو" کامل پھوہڑ کو یہ کہنے کا کبھی موقع ہی نہیں ہوتا۔

(۴) علامت نمبر ۱ اور علامت نمبر ۲ اس خوردبین کے دو لینز ہیں جن سے شوہر کے عیوب دس کروڑ گنا بڑے نظر آتے ہیں پھوہڑ اگر شرافت سے دوچار کو بھی رکھ لیتی تو اس خوردبین کے دونوں نہیں تو ایک لینز ضرور بیکار ہو جاتا۔ مگر وہ پھوہڑ ہی کیا جس کی خوردبین کی طاقت وسعت روزانہ ترقی نہ کرے۔

(۵) پھوہڑ کی خوردبین میں فوٹو لینے کی طاقت (ENLARGED SIZE) قدرتی طور پر موجود ہوتی ہے

(۶) پھوہڑ کا حافظہ بو علی سینا کے حافظہ کو مات کرتا ہے۔ ہر بات کا پس و پیش ہر لفظ کی شان نزول اسے ازبر رہتی ہے۔

(۷) پھوہڑ کے ذہنی نشو و نما اور طاقتِ گویائی کے متعلق ستائیس لاکھ علامتیں اور ہیں جن کے ذکر کی ضرورت نہیں۔ بات بات پر پچھلے سے پچھلے سال کے نقش کھنچتے ہیں تقریروں کی خاموشیوں کی تصویریں دکھائی جاتی ہیں۔ ماضی گویا پھوہڑ کا لازوال خزانہ ہے۔

(۳۷۲۵۰۰۸) پھوہڑ ہمیشہ صحیح بات کہتی ہے اور ہمیشہ بے موقع نوکروں کی بدتمیزی۔ بے پروائی۔ بد دیانتی کا قصہ عین اس وقت شروع کرے گی جب شوہر کو خاص طور پر آرام کی ضرورت ہو۔ نوکروں کے متعلق پھوہڑ کی ایک سو بہتر لاکھ علامتیں اور ہیں جن میں سے چند کا ذکر کیا جاتا ہے۔ (افسوس ہے کہ حساب غلط ہو گیا پھوہڑ کی اکاون لاکھ کروڑ علامتیں ہیں)

۳۷۲۵۰۰۸ + (۱۷۲۰۰۰۰) شوہر کی موجودگی میں بھلی صورت والی نوکرانی پر ضرور سختی کرے گی تاکہ شوہر کا دل اس کی طرف مائل نہ ہو جس شوہر کو کبھی اس بات کا خیال بھی نہ ہو، وہ بھی ہمدردی کرنے لگتا ہے۔

+ ۱ (۲۰۹۲۵۰۱۰) شوہر کو پانی کی پیاس ہو تو بہ تکلف شربت پینے پر مجبور کرتی ہے شربت جلدی سے طیار کرانے میں نوکرانیوں کا زبان کی قینچی سے وہ قیمہ کرتی ہے کہ شربت زہر ہو جاتا ہے۔ اگر بھول کر خود شربت پیش کر دے تو لطف سی بات نہیں مٹھتی۔ باقی شربت بانٹنے کے اودھم میں گھر بھر سر پر اٹھا لیتی ہے۔ اور عین اسی وقت" ارے گلاس تو اٹھاؤ"؛ "خوانچہ تو لائے ہوتے" "صراحی

تو ڈھانکی ہوتی" کے وہ نعرے لگاتی ہے کہ عرشِ معلیٰ کے فرشتے تک کانوں میں انگلیاں دے لیتے ہیں۔ گھر کے انتظام میں پھوہڑ کے متعلق ایک سو ایک ارب علامتیں اور ہیں جن میں سے چند کا ذکر ضروری ہے (حساب پر لعنت! پھر غلط ہو گیا۔ پھوہڑ کی اکادن لاکھ ارب سنکھ علامتیں ہیں۔ اب بھی غلط ہو جائے تو اللہ کرے کہ "ہمایوں" کے مدیر صاحب کی کسی بنئے سے دوستی ہو جائے)

(کئی ارب سنکھ) پھوہڑ کا شوہر جب گھر میں داخل ہوتا ہے تو پھوہڑ ہمیشہ کسی ضروری کام میں مصروف ہوتی ہے۔ بلکہ جہاں ہو وہیں سے باآواز بلند ہانک لگاتی ہے "ارے کمبختو! صاحب آ گئے۔ وہ چائے نہ شربت" بدحواسی میں تن بدن کا ہوش نہیں ہوتا اور تھکے ماندے شوہر کی دل جوئی کے بجائے ایک قیامتِ صغریٰ کا نمونہ روزانہ ان کی نذر ہوتا ہے۔ اس طویل داستان کے کئی لاکھ ارب سنکھ باب ہیں شوہر گھر سے نکلے تو نرمالشیں یا وہانیاں نوازشیوں کے گلے شکوے گھر میں آئے تو وہ ہُو و ہائے کہ الامان۔ اس قصّے کے لئے عمرِ نوح چاہیئے۔

(اب یہ حساب نہ مجھ سے سنبھلے نہ کسی بنئے کے باپ سے۔ پھر نئے سرے سے شروع کرتا ہوں)

(۱) پھوہڑ شوہر کے خوش کرنے کے لئے سستا اور پرانا کپڑا استعمال کرتی ہے اچھے اور نفیس کپڑے کو سنبھال کر رکھتی ہے۔ گوٹا ماند پڑ جائے، ریشم کو کیڑے چاٹ جائیں، مگر پھوہڑ کے سلیقہ میں فرق نہیں آتا۔

(۲) پھوہڑ مروجہ فیشن سے سوا لاکھ میل پیچھے ہوتی ہے۔

(۳) پھوہڑ ہر کپڑے کے متعلق شوہر سے بیوی پیشگی مشورے کرکے عین اس کی رائے کے برعکس کپڑا بنواتی ہے اور پہنتی ہے۔ بے موقع نمائش کی مرحد اور سہیلیوں کے گنوں کی مداح (لاحول ولا قوۃ! پھوہڑ کی صرف سہیلیوں سہیلیوں کے متعلق کئی کروڑ سنکھ علامتیں ہیں اس کے متعلق کوئی نئی گنتی ایجاد ہونی چاہیئے)

نئی گنتی ا سے ی تک (اور A سے Z تک) پھوہڑ سہیلیوں کی شکل و صورت کی کبھی تعریف نہیں کرتی بلکہ ان کے کپڑے کی۔ زیور کی روپیہ جوڑنے کی تعریف میں پُل باندھ دیتی ہے۔ سہیلی اور سہیلی کے شوہر کی لڑائی میں ہمیشہ سہیلی کے شوہر کو جھوٹا قرار دیتی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیتی ہے "پھر بھی بچارا بہتوں سے اچھا ہے۔ اور لوگوں کی طرح بات کا بتنگڑ تو نہیں بناتا"

پھوہڑ کی سہیلی گھر میں وارد ہو تو گھر میں شوہر کا حقہ پانی بند۔ "آخر تم جانتے ہو کہ گھر میں مہمان ہیں۔ ذرا دیر ہوئی تو کیا قیامت آگئی کہ گھر بھر سر پر اُٹھا لیا۔ مجھے تو دیکھو کہ دن رات کام میں مرتی ہوں کبھی شکایت کی ہے؟ کمبخت دھوبی کو آٹھ دن سے کہہ رکھا تھا کہ چاندنی دے جانا۔ آج تک نہ لایا۔ ایسی شرم آ رہی ہے کہ کیا کہوں۔ تمھاری بلا سے۔ تم کو میرے دل کا کیا حال معلوم؟" علیٰ ہٰذا القیاس طلسم ہوش ربا کی سات جلدیں ختم ہو جائیں یہ تقریر نہ ختم ہو۔

(ہر قسم کی گنتی ختم ہو گئی۔ مگر علامتیں ابھی بہت ہیں۔ سنتے ہیں کہ جاپان کی ہر چیز سستی ہے گنتی بھی وہیں سے خریدیں گے۔ بل آئے گا

تو دام ادا کر دیں گے فی الحال استعمال کر لیتے ہیں)

(8) پھوہڑ بیوی بچے دیتی ہے۔

(9) پھوہڑ بیوی بہت بچے دیتی ہے۔

(10) بچوں کے ساتھ شکایتیں بھی پیدا کرتی ہے۔

بچوں کی شکایتیں۔ اپنی شکایتیں۔ دنیا جہان کی شکایتیں بر موقع محل کے لیئے اور بے موقع بے محل ہزارہا شکایتیں اور شوہر سے فوری فیصلہ کی طلبگار رہتی ہے۔

(11) پھوہڑ بیوی صبر کرتی ہے اور بے انتہا صبر کرتی ہے اور اس صبر کا بے انتہا ذکر کرتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پھوہڑ بیویوں کے صبر کے حساب کتاب کے لیئے ایک نئی قیامت کا اجرا کیا جائے گا۔

(12) پھوہڑ بیویوں کی ماؤں کی شفقتِ مادرانہ کے سیلابِ عظیم کا مقابلہ سدِ سکندری سے ہو تو ہو چین کی دیوار تو اس کو روک نہ سکی۔

(آخری نوٹ:۔ اصلی پھوہڑ بیویاں آج کل کمیاب ہیں شادی کی منڈیوں میں نقلی مال کا زور ہے۔ خاندان ہی مٹ گئے تو اب وہ خاندانی وضعداریاں کہاں؟ شوہر کے منہ پر شوہر کے دوستوں کو کوسنا اب محض خواب و خیال ہے۔ ممکن ہے دِلّی لکھنؤ کی راکھ کریدنے سے یہ زرِ گم گشتہ دستیاب ہو جائے مگر امید کم ہے)

"فلک پیما"

مرد کبھی ان عورتوں سے شادی نہیں کرتے جنھیں وہ سمجھ لیتے ہیں۔ اور عورتیں کبھی ان مردوں سے محبت نہیں کرتیں جنھیں وہ خوب سمجھ لیتی ہیں۔

ک۔ ک

رعنائیِ خیال

کیا آب و تاب فکر ہے؟ کیا طلعتِ خیال
پھیلا ہوا ہے ذہن میں ادراک کا جمال

کیا لحنِ دلنواز سماعت فروز ہے
اک حسنِ سحرکار ہے صورت گرِ خیال

شمعیں سی جل رہی ہوں دھندلکوں میں جس طرح
یوں عالمِ خیال میں ہے بارشِ جمال

راتوں کی کائنات بھی کیا کائنات ہے
نیندوں کا اک غبار ستاروں کا ایک جال

بربط نواز کون ہے تاروں کے حسن میں؟
جذبات کر رہے ہیں یہ ادراک سے سوال

کتنی لطیف ہے مہ و پرویں کی راگنی
لہرا رہے ہیں دل کے افق پر حسیں خیال

لہرا رہے ہیں دل کے افق پر حسیں خیال
نکھرے ہوئے ہیں حسنِ تصوّر کے خد و خال

کتنی کہانیاں ہیں ادھوری پڑی ہوئی
کتنی حکایتیں ہیں ابھی تشنۂ مآل

رعنائیِ خیال کی تفسیر کیا لکھوں
رعنائیِ خیال کی تفسیر ہے محال

عدمؔ

افسانہ اور حقیقت نگاری

مغربی ممالک میں جہاں روایات و رسمیات کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے کی ہوا چلی ہوئی ہے، آئے دن نئی نئی تحریکیں پیدا ہوتی رہتی ہیں جن میں سب سے جدید اور مشہور تحریک حقیقت نگاری کی ہے۔ علماء کا ایک گروہ اس بات پر مصر ہے کہ ادب و شاعری میں زندگی کے حقیقی واقعات اور فطری امور کی من و عن ترجمانی ہونی چاہیئے۔ یہ لوگ "حقیقیین" (ریلیسٹ) کہلاتے ہیں۔ اگر حقیقت نگاری کا مسئلہ نہایت وسیع اور کثیر المعنی نہ ہوتا تو کبھی کی اس کی دھجیاں اڑ گئی ہوتیں لیکن وہ نت نئے لباس میں جلوہ گر ہوتا رہتا ہے جب اس مسئلہ کے ایک مفہوم کی تردید کر دی جاتی ہے تو "حقیقیین" اس کا دوسرا مفہوم پیش کر دیتے ہیں اس طرح حقیقت نگاری نے ایک مستقل ادبی مسئلے کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔

جہاں تک تنقیدی ادبیات کا تعلق ہے تحریکِ حقیقت نگاری کے حامیوں کی رائے بڑی حد تک اصابت و معقولیت سے ہم آغوش معلوم ہوتی ہے چنانچہ اڈمنڈ برک کا قول ہے کہ "آج کل کے نقاد فنونِ لطیفہ کے قواعد و ضوابط کی تلاش جہاں کرنی چاہیئے وہاں نہیں کرتے بلکہ غلط مقام پر کرتے ہیں۔ وہ نظم، تصویر، بت، عمارت اور منبت کاری میں ان کا سراغ لگاتے ہیں۔ حالانکہ خود عمل صناعی میں وہ معیار مفقود ہوتا ہے جو کسی اعلیٰ قدرتِ فن کار (آرٹسٹ) کے پیشِ نظر رہنا چاہیئے یہی وجہ ہے کہ تمام صناع بالعموم اور شعراء بالخصوص ایک تنگ دائرہ میں محدود رہتے ہیں نقاد بھی انھیں کا اتباع کرتے ہیں اس لیئے وہ ہماری صحیح رہنمائی نہیں کر سکتے اگر ہم کسی شئے کی قدر و قیمت کا اندازہ کسی خارجی معیار سے نہیں بلکہ خود اسی شئے کے نوعی معیار سے لگائیں تو وہ ضرور ناقص ثابت ہوگا۔ فی الحقیقت فنونِ لطیفہ کے حسن و قبح کے جانچنے کا معیار ہر شخص کے پاس موجود ہے۔ بسا اوقات نہایت ادنیٰ اور معمولی چیزوں کے مشاہدہ و معائنہ سے ہمیں سچی روشنی حاصل ہوتی ہے۔ اور اس کے برعکس بڑی سے بڑی ہوش مندی و عرق ریزی جو معمولی مشاہدات کو حقیر و ذلیل سمجھتی ہے ہمیں تاریکی میں چھوڑ دیتی ہے یا اپنی جھوٹی مصنوعی روشنی سے ہمیں گمراہ کر دیتی ہے۔"

تحریکِ حقیقت نگاری کے نامور علمبرداروں کا خیال ہے کہ سچا نقاد کسی صناع یا مصنف کا دوسرے صناع یا مصنف کے ساتھ مقابلہ کرنے کے بجائے یہ دیکھنے کی کوشش کرتا ہے کہ اس نے فطرتِ بشری کی کس حد تک ترجمانی کی ہے۔ فنونِ لطیفہ کے معائب و محاسن کے جانچنے کا بہترین معیار وہ ہے جو "سادگی، راستی اور فطرتیت" پر مبنی ہو لیکن عوام اپنی "سادگی، راستی اور فطرتیت" کے آزادانہ استعمال میں پس و پیش کرتے ہیں اور روایتی نقاد کی رائے آسانی سے قبول کر لیتے ہیں۔ یہ ان کی انتہائی کمزوری ہے۔ وہ جو کچھ دیکھتے یا پڑھتے ہیں اس کا موازنہ یا مقابلہ

قدرتی مخلوق سے نہیں بلکہ کسی باکمال و چابک دست صنّاع کی ذہنی تخیلی پیداوار پیش کرتے ہیں۔ اگر ان میں فن کاری کی تھوڑی بہت صلاحیت موجود ہوتی ہے تو وہ حقیقی زندگی کا اتباع کرنے کے بجائے کسی اعلیٰ قدرت صناع کی تقلید کرنے لگتے ہیں۔ حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ خود اس اعلیٰ قدرت صناع کے کمال کا راز حقیقی زندگی کی پیروی و ترجمانی میں مضمر ہے۔

بالعموم اگر کوئی نوجوان مصنف روزمرہ زندگی کے حقیقی واقعات کی ترجمانی کرتا ہے۔ یا آدمیوں کو اپنے اردگرد جس طرح بولتے اور کام کرتے ہوئے پاتا ہے۔ ویسے ہی بیان کر دیتا ہے تو روایتی نقاد جھٹ اس پر ادنیٰ و حقیر شے پیش کرنے کا الزام عائد کر دیتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ نوجوان مصنفوں کے افسانوی کردار جیتے جاگتے انسانوں کی طرح نہیں بلکہ شکسپیر، اسکاٹ، تھیکرے۔ بالزاک۔ ہاتھورن یا ڈکنس کے رجال داستان کی طرح بولیں اور عمل کریں۔ غرض کہ ذاتی تجربہ و مشاہدہ کو پس پشت ڈال کر دوسروں کے منقولات اور تخیلی نتائج کی پیروی کرنا قابل تعریف سمجھا جاتا ہے حقیقت نگار و صداقت پسند مصنف کو روایتی نقاد کی جانب سے جو ہدایت دی جاتی ہے۔ اس کی حیثیت ویسی ہے جیسے ایک سائنس داں سے کوئی کہے کہ "میں دیکھتا ہوں کہ تم اس ٹڈے کا بڑے غور سے معائنہ و مطالعہ کر رہے ہو جو گھاس میں پھدک رہا ہے۔ شاید تم اسے جیسا دیکھ رہے ہو ویسا ہی بیان بھی کر دوگے۔ لیکن یہ نہ صرف تضیع اوقات ہے بلکہ وضع کے خلاف اور تہذیب کے منافی بھی ہے۔ ادھر آؤ میرے پاس ایک اعلیٰ درجہ کا ٹڈا ہے جو بڑی محنت اور کثیر صرف سے تیار کیا گیا ہے۔ یہ ٹڈوں کا بہترین نمونہ ہے۔ بنا تو ہے وہ تار اور پٹھے ہی کا لیکن اس پر کیسا عمدہ رنگ و روغن چڑھایا گیا ہے معمولی قدرتی ٹڈوں سے وہ ہزار درجے زیادہ خوب صورت۔ خوشنما اور نفیس ہے۔ تم چاہو تو اسے مصنوعی کہہ لو مصنوعی تو وہ ضرور ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ مثالی و آئیڈیل بھی ہے۔ قدرتی ٹڈے کی طرح یہ معیاری ٹڈا آسانی سے ہلاک و برباد نہیں ہو سکتا تم کو بھی مثالی و معیاری چیزوں کی پیروی کرنی چاہیئے۔ تمام فنی کتابوں میں تم میرے ہی ٹڈے کا ذکر پاؤ گے تمھارے گھانس میں پھدکنے والے حقیر ٹڈے کی صناعوں اور فن کاروں کی نظروں میں کوئی قدر نہیں تم اپنے قدرتی ٹڈے کے متعلق جو بیان شائع کروگے وہ نقادوں کے نزدیک ایک ادنیٰ امتبذل۔ عامیانہ اور حقیر و ذلیل چیز ہوگی۔ اور اگر تم اسے ادنیٰ و حقیر نہ بھی سمجھو تو اس کی زیادہ سے زیادہ تعریف یہی ہو سکتی ہے۔ وہ حقیقی و قدرتی ٹڈے کی عکسی تصویر ہے کسی شے کی عکسی تصویر پیش کرنا صناع کے ضعف و عجز کی دلیل ہے صناعی کا اقتضاء ہے کہ کسی شے پر تخیل کا رنگ چڑھا کر اسے قدرتی اشیاء سے کہیں زیادہ خوب صورت و نظر فریب بنا دیا جائے۔" حقیقیین کہتے ہیں کہ جب تک اس مثالی ٹڈے کو سائنس سے۔ ادبیات سے اور فنون لطیفہ سے یکسر خارج نہ کر دیا جائے بلکہ جب تک اس معیاری ٹڈے۔ ہیماتی ٹڈے۔ شجاع و بطل ٹڈے۔ قدیم رومانی ٹڈے۔ تار اور پٹھے کے مصنوعی ٹڈے کو بالکل فنا نہ کر دیا جائے! اس وقت تک سادہ حقیقی اور فطری ٹڈے کے میدان میں آنے اور عوام کی توجہ جذب کرنے کی توقع نہیں۔ فنون لطیفہ کی جانچ پڑتال کے جس معیار تک ہر شخص کی دسترس ہے۔ وہ "سادہ حقیقی اور فطری" ہے لیکن روایتی نقادوں کا قائم کردہ معیار مشکل پیچیدہ۔ کتابی اور مصنوعی ہے۔

اوپر جو کچھ بیان ہوا وہ خلاصہ ہے حقیقیین کے مقاصد و دعاوی کا۔ اس میں بہت سی کام کی باتیں ہیں جن سے ہر مصنف کو استفادہ کرنا

چاہیئے حقیقت نگاری کے حامی جب تک حدِ اعتدال سے تجاوز نہیں کرتے ان کی رائے نہایت صائب معقول اور قابلِ تسلیم ہوتی ہے لیکن جب انتہا پسند حقیقتین تنگ نظری سے کام لیتے ہیں تو ان کا ہر قول و فعل سخت مضحکہ خیز بن جاتا ہے مثلاً بعض انتہا پسندوں کا خیال ہے کہ حقیقت نگاری زندگی یا جزوِ زندگی کی تصویر کشی کا نام ہے اس لیئے افسانہ نویس کو چاہیئے کہ زندگی کے تمام چھوٹے بڑے واقعات کو بے کم و کاست بیان کرے لیکن انسان کی روزانہ زندگی میں سیوں ایسے واقعات پیش آتے ہیں جو ایک دوسرے سے تعلق نہیں رکھتے۔ فرض کرو کہ قصہ نویس کسی ڈاکو کا کارنامہ پیش کرنا چاہتا ہے۔ ڈاکو کی زندگی میں روزانہ صبح سے شام تک نہ جانے کتنے ادنیٰ و اعلیٰ واقعات پیش آتے ہوں گے جو چوری ڈکیتی اور رہزنی سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ اگر مصنف ترک و انتخاب سے کام نہ لے اور تمام واقعات بیان کرنے لگے تو حقیقت نگاری محض غیر متعلق واقعات و حادثات کی کھتونی بن جائے گی جس میں دلچسپی اور ڈرامائیت یکسر مفقود ہوگی۔ حقیقتین کی ایک جماعت اس خیال کی موید ہے کہ افسانہ نگار کو اپنی ساری تگ و دو صرف ذاتی تجربات و مشاہدات کی ترجمانی تک محدود رکھنی چاہیئے چنانچہ جین آسٹن تو اس بات کی بھی روادار نہیں کہ کوئی شہری مصنف دیہاتی زندگی کا اور دیہاتی مصنف شہری زندگی کا نقشہ پیش کرے۔ بلکہ وہ عورتوں کو مشورہ دیتی ہیں کہ اگر ان کو افسانہ نویسی کا شوق ہو تو اپنی تصنیفات میں ایسے مکالمہ یا گفتگو کو راہ نہ دیں جو مرد اپنی خالص مردانہ مجلس میں جس میں کوئی عورت شریک نہ ہو ایک دوسرے کے ساتھ کیا کرتے ہیں لیکن ایسا کرنا فی الحقیقت طائرِ تخیل کے پر و بازو کو توڑ مروڑ کر پھینک دینا ہے۔ کیا دنیا کے وہ بلند پایہ رومانی و تاریخی افسانے صرف اس بنا پر بے حقیقت و بے سود قرار دیئے جاسکتے ہیں کہ ان میں جو واقعات درج ہیں وہ مصنفوں کے ذاتی تجربہ و مشاہدہ میں نہیں آئے تھے؟ سچ پوچھو تو تخیل و خیال آرائی کے ذریعہ سے ماضی کو حال، غائب کو حاضر اور بعید کو قریب بنا کر پیش کرنا کمالِ فن ہے۔ حقیقتین کا ایک گروہ ایسا بھی ہے جو زندگی کے کسی شعبہ کو پس پردہ رکھنا حقیقت و صداقت کے منافی خیال کرتا ہے۔ ان لوگوں نے حیاتِ انسانی کے بعض کثیف اور تاریک پہلوؤں کو نمایاں کرنے میں اس قدر غلو سے کام لیا ہے کہ ان کے اسلوبِ بیان کے ڈانڈے عریانی و فحاشی سے جا ملے ہیں۔ ان کی پیش کی ہوئی زندگی کی برہنہ تصویریں دیکھ کر حیا آنکھیں بند کر لیتی اور تہذیب منہ پھیر لیتی ہے۔

بہر حال مختلف مصنفوں نے مختلف طور پر حقیقت نگاری کی تشریح کی ہے جن میں سے دو کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ آج کل تحریکِ حقیقت نگاری کے سب سے بڑے نقیب امریکی مصنف مسٹر ہاولز (HOWELLS) ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ مختصر الفاظ میں حقیقت نگاری اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ادبی مواد پر سچائی کے ساتھ بحث کی جائے۔ ان کے نزدیک انگریزی ناول نویسوں میں صرف جین آسٹن کو یہ ملکہ حاصل تھا۔ دوسرے کسی مصنف نے جین آسٹن کی طرح موادِ افسانہ پر سچائی اور دیانت کے ساتھ بحث نہیں کی ہے لیکن ہاولز کی یہ مجمل تعریف بھی اطمینان بخش نہیں ہے کیونکہ فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مواد پر سچائی کے ساتھ بحث کرنے کی امتیازی علامت کیا ہے؟ سچائی کے ساتھ بحث کرنے میں کون کون سی باتیں بیان کرنی چاہیئیں۔ اور اس بحث کے کیا مخصوص طریقے ہیں؟ اب ہم خود کو جہاں سے چلے تھے وہیں پاتے ہیں۔

مواد پر سچائی کے ساتھ بحث کرنے کی تشریح کرتے ہوئے مسٹر ہاولز۔ ایمرسن کے ہم زبان ہو کر فرماتے ہیں کہ "ہمیں شان دار

عظمت غیر معمولی اور رومانی چیزوں کی ضرورت نہیں حقیقت نگاری کا علم بردار ہونے کی حیثیت سے ہم تو معمولی ادنیٰ اور مانوس اشیا ہی سے تعلق رکھنا چاہتے ہیں"۔ لیکن یہاں حقیقت نگاری کے ڈانڈے رومانیت سے مل جاتے ہیں۔ رومانی شاعروں کے سرتاج برنس اور ورڈس ورتھ سے بڑھ کر اور کس نے ادنیٰ، حقیر، معمولی اور مانوس چیزوں پر طبع آزمائی کی ہوگی؟ کہا جا سکتا ہے کہ رومانی شاعروں کا مقصد یہ تھا کہ وہ ادنیٰ اور معمولی اشیا کو اپنے زور تخیل سے بطلی اور رومانی بنا دیں لیکن حقیقت نگاری کے نامور علم بردار بھی اس مقصد سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جن چیزوں کو لوگ ادنیٰ و حقیر جان کر ترک کر دیتے ہیں۔ وہ بھی کارخانۂ قدرت کے قیمتی پرزے ہیں تخلیق کائنات کے اعلیٰ ربانی مقصد کی تکمیل میں ان کا بھی حصہ ہے جس اینٹ کو معمار بے کار سمجھ کر رد کر دیتے ہیں بسا اوقات عمارت کے سرے پر اس کی ضرورت پیش آتی ہے۔ بہرکیف چھوٹی چھوٹی اور معمولی معمولی چیزیں بھی اپنی ذاتی قدر رکھتی ہیں اور ان میں شاعروں اور افسانہ نویسوں کے جذب تخیل کا پورا سامان موجود رہتا ہے۔ علاوہ بریں کیا کوئی شخص یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ برنس اور ورڈس ورتھ نے ادنیٰ و حقیر کو بطلی و رومانی درجہ تک بلند کرنے کی فکر یا اخلاقی تعلیم و تلقین کی دھن میں اپنے مواد شاعری کی تکذیب کی ہے۔ یا اس پر سچائی سے بحث نہیں کی ہے۔ یا اس کو اس کی فطری سادگی و صداقت سے معرا بنا دیا ہے؟ الغرض صرف "حقیقیین" ہی نہیں بلکہ رومانی شعرا و مصنفین بھی ادنیٰ و حقیر چیزوں سے مصافحہ گیر ہوتے اور مواد پر سچائی کے ساتھ بحث کرتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ عام طور پر حقیقت نگاری (REALISM) کو رومانیت (ROMANTICISM) اور مثالیت (IDEALISM) کے خلاف سمجھا جاتا ہے لیکن دراصل ان میں کوئی آب بند تفریق موجود نہیں ہے۔ ان کی سرحدیں باہم ملی ہوئی ہیں جن کے درمیان خط فاصل قائم کرنا مشکل ہے "حقیقت" میں "مثالیت" کا عنصر شامل ہے علاوہ اس کے حقیقیین کی تصنیفات میں اکثر ایسی ادبی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو "رومانیت" کا طرۂ امتیاز ہیں "حقیقت" میں رومانی معنی بھی پنہاں ہوتے ہیں جس کی وجہ سے بعض وقت ٹھیٹھ واقعات اور خیال آرائی کے نتائج میں امتیاز کرنا دشوار معلوم ہوتا ہے ہم کسی افسانوی شاہکار کو خالص حقیقی یا رومانی یا مثالی نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس میں تینوں کے اوصاف کم و بیش پائے جاتے ہیں۔ اگر تینوں میں فرق ہے تو نوعیت و کیفیت کا نہیں بلکہ صرف کمیت و تناسب کا۔ اس لئے ہمیں دیکھنا چاہئے کہ حقیقیین کن باتوں پر زیادہ زور دیتے ہیں۔

مسٹر ہاولس نے حقیقت نگاری کی جو تعریف بیان کی ہے اس پر اوپر بحث ہو چکی۔ اب ہم ایک دوسرے نامور حامی حقیقت "مسٹر زولا" کے خیالات کا جائزہ لینا چاہتے۔ واضح رہے کہ عام طور پر بالزاک تحریک حقیقت نگاری کا نقیب اول اور زولا اس کا آخری علم بردار سمجھا جاتا ہے۔ بہرحال زولا کے خیال کے مطابق حقیقت نگاری ایک طرف تو خیال آرائی کے منافی ہے جس میں رومانیت اور پرشکوہ اسلوب بیان شامل ہے۔ اور دوسری طرف وہ تمام مثالی (آئیڈیل) چیزوں کو اپنے دائرہ سے خارج کر دیتی ہے حقیقت نگار مصنف صرف آنکھوں دیکھی اور کانوں سنی باتیں بیان کرتا ہے! وہ غیر حقیقی مبہم، شاندار، غیر معمولی اور اصلاحی و اخلاقی موضوع پر کبھی بحث نہیں کرتا جو چیزیں اس کے ذاتی مشاہدہ و تجربہ میں نہ آئی ہوں۔ ان سے وہ کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ وہ صرف معاصر واقعات اور گرد و پیش کے معاملات کی ترجمانی کرتا ہے۔ وہ انسانی زندگی اور قدرتی اشیا کی ہوبہو تصویر پیش کرتا ہے اور خیال آرائی و نکتہ آفرینی سے کام نہیں لیتا۔ غرض کہ زولا دنیائے افسانہ سے رومان، پوشیدہ روحانی صداقت، تعبیر و تشریح اور خیال آرائی کو خارج کر دیتا ہے۔

وہ انسان کے قول و فعل کو من و عن بیان کر دینے پر زور دیتا ہے وہ نہیں چاہتا کہ انسانی سیرت اور مسائلِ زندگی کی تعبیر کی جائے مختصر یہ کہ وہ شخصی نقطۂ نظر (PERSONAL POINT OF VIEW) یا ذاتی رائے زنی کا سخت مخالف ہے۔ ایک اور قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ وہ ان تمام چھوٹے بڑے اہم و غیر اہم ادنیٰ و اعلیٰ واقعات کو جو تجربہ و مشاہدہ میں آئیں ادبی مواد میں شامل کر دیتا ہے۔ تحریکِ حقیقت نگاری کا یہی وہ پہلو ہے جو مدت سے حقیقیوں اور مثالیوں کے مابین کبھی جمالیاتی اور کبھی اخلاقیاتی بنا پر وجہ نزاع بنا ہوا ہے۔ حامیانِ تحریکِ مثالیت کے نزدیک حقیر مبتذل اور عامیانہ موضوع پر خامہ فرسائی کرنا اعلیٰ لٹریچر کی شان کے خلاف ہے۔

مسٹر ہاولس کا قول ہے کہ "خدا کی پیدا کی ہوئی کوئی چیز حقیر و ذلیل نہیں ہو سکتی۔ عقلمند آدمی انسانی زندگی کے کسی پہلو یا کسی شعبہ کو ناقابلِ التفات سمجھ کر اس کی تحقیر نہیں کر سکتا۔ کیا کوئی سائنس داں مادی دنیا کے کسی واقعہ کو اپنی تحقیق و تفتیش کی شان کے خلاف تصور کر سکتا ہے؟ ایک حقیقت نگار مصنف تمام اشیائے عالم کی مساوات اور بنی نوع انسان کی آفرینشی وحدت کا قائل ہوتا ہے۔ اس کی روح کو تمام تخیلی اور مثالی اشیا سے نہیں بلکہ حقیقت و واقعیت سے ترفع حاصل ہوتا ہے کیونکہ حقیقی واقعات ہی میں سچائی پائی جاتی ہے"۔ ادبیات کے متعلق یہی نقطۂ خیال ان بے شمار مبتذل، بے لطف اور ادنیٰ درجہ کے افسانوں کا ذمہ دار ہے جو سستے رسالوں میں آئے دن چھپتے رہتے ہیں اور جن کا وجود صرف اس لئے جائز خیال کیا جاتا ہے کہ وہ روزمرہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے ناقابلِ توجہ امور کی آئینہ داری کرتے ہیں۔

آج کل کے بعض انتہا پسند حقیقیین ماہرینِ سائنس کی طرح زندگی کے جزئیات و تفصیلات کی تلاش و تحقیق میں سرگرداں نظر آتے ہیں حالانکہ اگر یہی جاں کاہی و دماغ سوزی کسی اور جانب منعطف ہوتی تو عظیم الشان نتائج برآمد ہوتے۔ خوردبین کے پیہم استعمال سے تناسبات کے احساس میں ضرور خلل واقع ہوگا جن لوگوں کی ساری توجہ زندگی کے صرف جزئی امور پر مبذول رہتی ہے۔ ان کے دلوں میں شاندار حیاتی واقعات کی عظمت باقی نہیں رہتی وہ حیاتِ انسانی کے ادنیٰ پہلو کو اس کے اعلیٰ پہلو پر ترجیح دینے کے عادی بن جاتے ہیں۔ یہ بھی ایک غور طلب سوال ہے کہ ادبیات میں سائنس کے معیار و مقصد کے استعمال سے فنی لطافت باقی بھی رہے گی یا نہیں؟ سائنس اور لٹریچر میں زمین آسمان کا فرق ہے جو طریقۂ تحقیق یا اسلوبِ بحث سائنس کے لئے حیات بخش ہوتا ہے وہی اکثر حالتوں میں ادب و شاعری کے لئے پیامِ اجل بن جاتا ہے۔ اس مادی دنیا کے تمام واقعات و مظاہر حکمیانی محقق کی نظر میں یکساں ہوں تو ہوں لیکن سچا صناع (آرٹسٹ) ہر زمانہ میں اشیائے عالم کی ربانی مساوات کا منکر رہا کیا ہے۔ ہم اپنے ارد گرد جتنی چیزیں دیکھتے ہیں ان میں قدر و قیمت کے لحاظ سے بے شمار مدارج پائے جاتے ہیں۔ یہ تفریق خود دستِ قدرت نے کر دی ہے مثل مشہور ہے کہ خدا نے پانچوں انگلیاں برابر نہیں بنائی ہیں۔ قدر و قیمت کے اختلاف ہی کی وجہ سے انتخاب کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ہر صناع اپنی ذہنی پیداوار میں ربط و تسلسل قائم کرنے کے لیے صرف ضروری واقعات کا انتخاب کرتا اور غیر اہم و بے تعلق واقعات کو چھوڑ دیتا ہے۔ حقیقیین (REALISTS) اور مثالیین (IDEALISTS) دونوں حقِ انتخاب کے مدعی ہیں لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ اول الذکر کی نظرِ انتخاب ہمیشہ ادنیٰ حقیر مبتذل اور عامیانہ اشیا پر پڑتی ہے کیونکہ وہ صرف انھیں چیزوں کو واقعیت اور صداقت کا حامل خیال

کرتے ہیں برخلاف اس کے حامیانِ مثالیت کی نظر شاندار پُرعظمت باوقار معیاری اور اعلیٰ و ارفع اشیا پر رہتی ہے اگر انتہا پسند حامیانِ حقیقت علمی و مثالی چیزوں پر یقین نہیں رکھتے اگر ان کو اپنے ذاتی تجربات کے محدود دائرہ ہی میں تسکین و تشفی کا پورا سامان مل جاتا ہے تو کیوں نہ ان کو ادبیات کی رفیع الشان عمارت کے ایک حجرے میں آزاد چھوڑ دیا جائے۔ لیکن مشکل تو یہ ہے کہ وہ اپنا حجرہ چھوڑ کر ہمسایوں کے کمرے میں گھس جاتے اور ان کو پریشان کرتے ہیں۔ وہ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ساری عمارت انھیں کے زیرِ تصرف ہے۔

اگر انتہا پسندی کو راہ نہ دی جائے تو حقیقت، رومانیت اور مثالیت کا اجتماع ممکنات سے ہے مثلاً تھیکرے کی تصنیفات میں تینوں کی خوبیاں اس انداز میں پائی جاتی ہیں کہ بتانا مشکل ہے کہ وہ حقیقی تھا یا رومانی یا مثالی۔ اسے جس زمرہ میں بٹھایا جائے وہ اسی کا ایک فرد معلوم ہوگا۔ سچ پوچھو تو حقیقت پرستی کوئی نئی ادبی تحریک نہیں ہے۔ البتہ آج کل اس میں نئی نئی کونپلیں پھوٹ نکلی ہیں۔ افسانوی دنیا میں حقیقت اور رومانیت کی پیدائش ایک ہی ساتھ ہوئی تھی اس وقت سے دونوں باری باری سے یا پہلو بہ پہلو نشو و نما پاتی اور ترقی کرتی رہی ہیں ان کے توالی پر نقادوں کے رجحانات عوام کے مذاق پسند اور زمانہ کی روح کا زبردست اثر پڑا کیا ہے۔ زمانہ کے رنگ و میلان کی تحریک و تہییج سے ادبی رقاص آگے پیچھے جھولتا رہا ہے یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ جب کوئی ادبی تحریک اپنے منتہا کو پہنچ جاتی ہے تو لوگوں کی دلچسپیوں میں ردِ عمل شروع ہو جاتا ہے ایسے وقت میں نقادوں کے آگے صرف دو راہیں کھلی ہوتی ہیں۔ یا تو وہ بھی رقاص کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے ہیں یا پیچھے ٹھہر کر رقاص کی حرکت کا تماشہ دیکھتے ہیں۔

لیکن اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ادبی اسالیب پر تحریکِ حقیقت نگاری کا نہایت وسیع و مفید اثر پڑا ہے حقیقیین کا اصرار ہے کہ افسانہ کے واقعات کتنے ہی فرضی و تخیلی کیوں نہ ہوں لیکن اندازِ بیان ایسا ہونا چاہیئے کہ وہ بالکل صحیح اور سچے معلوم ہوں۔ اسے ہم ایک لفظ "نظر فریبی" سے تعبیر کر سکتے ہیں علاوہ بریں حقیقی مصنف مرئی و مقرون اور نوعی و جسمانی چیزوں کی بھی قدر کرتا ہے۔ رومانی لٹریچر میں بھی جو معنی خیز و التباس آفریں تفصیلات پائی جاتی ہیں وہ تحریکِ حقیقت ہی کے اثر کا نتیجہ ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ سوفٹ (SWIFT) ڈیفو (DEFOE) اور پو (POE) کا شمار سرآمد رومانی مصنفین میں ہوتا ہے لیکن انھوں نے اپنے افسانوں میں جزئی و تفصیلی امور اس خوبی کے ساتھ بیان کئے ہیں کہ ہر شخص کو ان کی صحت و صداقت کا دھوکا ہوتا ہے۔ ان کی تحریروں میں نظر فریبی و التباس آفرینی کی یہ قوت محض حقیقت نگاری کے اصول و مقتضیات کی پیروی سے پیدا ہوئی ہے البتہ یہ افسوس کی بات ہے کہ بعض ناتجربہ کار و جوشیلے حقیقیین احساسِ تناسب کھو کر اہم و ضروری واقعات کی ترجمانی تو کرتے نہیں لیکن چھوٹی چھوٹی غیر معروف باتوں کے بیان کرنے میں اس قدر منہمک ہو جاتے ہیں کہ ان میں وسیع النظری و کشادہ خیالی کا مادہ مفقود ہو جاتا ہے

علاوہ بریں روزمرہ زندگی کی ترجمانی کرنے اور ادنیٰ و معمولی معاملاتِ حیات کو ادب کی بنیاد قرار دینے میں تحریکِ حقیقت نگاری نے افسانوی دنیا میں بالعموم اور مختصر قصوں کے میدان میں بالخصوص نہایت اہم و نمایاں خدمت انجام دی ہے پرانے زمانہ کے افسانوں اور داستانوں میں بادشاہوں، سورماؤں اور سیاحوں کے محیر العقول مہماتی کارنامے بیان کئے جاتے تھے ان سے ہفت خواں طے کرایا جاتا تھا جنوں عفریتوں

اور دیوزادوں سے مقابلے ہوتے تھے پہاڑی چوٹیوں پر پریاں ملتی تھیں صحرائے طلسم میں اشہبِ تخیّل بالکل بے لگام چھوڑ دیا جاتا تھا ساحروں کے پھندے سے ہیرو کو نجات دینے کے لئے فوراً کوئی خضر نما درویش اپنے اعجازی عصا یا نقشِ سلیمانی کے ساتھ حاضر ہوتا تھا غرض کہ جو بات تھی وہ خلافِ فطرت اور جو واقعہ بیان کیا جاتا تھا وہ فوق العادات لیکن آج کل کے قصّوں اور افسانوں میں صرف ایسے واقعات بیان کئے جاتے ہیں جو حقیقی زندگی میں پیش آسکیں۔ اگر تخیل سے کام لیا بھی جاتا ہے تو اسے قوتِ ممیزہ کے تابع رکھ کر۔ افسانوی رجال بھی ہر درجہ اور ہر طبقہ سے منتخب کئے جاتے ہیں چنانچہ ڈاکٹر تاجر کسان۔ کاریگر مزدور منشی ساہوکار۔ گداگر سب کے سب افسانوی دنیا میں منظرِ عام پر آرہے ہیں اور آج کل تو اچھوت بھی ہیرو کی حیثیت سے روشناس ہونے لگے ہیں۔ یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ اوسط یا ادنیٰ درجہ کے آدمیوں کی زندگی کے واقعات کی ترجمانی کا مقصد بھی پست و ادنیٰ ہی ہوگا بلکہ روزمرہ زندگی سے تعلق رکھنے والے چھوٹے چھوٹے قصے اور افسانے جن کو عصرِ حاضرہ کے رسائل و جرائد میں اس قدر شہرت و مقبولیت حاصل ہے۔ ویسا ہی اعلیٰ و ارفع مقصد پیشِ نظر رکھتے ہیں جیسا انیسویں صدی کے اوائل میں عظیم الشان رومانی تحریک کا تھا اور جس نے دنیائے ادبیات میں ایک تہلکہ مچا دیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ آج کل ممالک متمدنہ کا عام رجحان ہی حقیقت پرستی و صداقت پسندی کی جانب ہے لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ حق و صداقت کی حمایت کا یہ عام جذبہ تحریکِ حقیقت نگاری ہی کا آفریدہ ہے۔ بہرحال ہماری روزانہ زندگی کے واقعات اور معمولی انسانی کردار میں مختصر قصّوں اور افسانوں کے لئے بے شمار چھوٹے چھوٹے موضوع ہاتھ آسکتے ہیں۔

لیکن بعض وقت حقیقت نگاری کے مدعیوں کا غلو اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ وہ صرف ادنیٰ حقیر، مبتذل اور عامیانہ چیزوں ہی کے پیش کرنے کو حقیقت نگاری کا واحد مقصد تصور کرنے لگتے ہیں حالانکہ ادنیٰ و عامیانہ چیزیں فی نفسہٖ کوئی ادبی قیمت نہیں رکھتیں جب تک تعبیر و تشریح (INTERPRETATION) سے کام نہ لیا جائے وہ بالکل بے وقعت ہوتی ہیں۔ ایک باکمال صنّاع (آرٹسٹ) زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات کو تعبیر و تشریح کی طلسمی قوت سے نہایت معنی خیز و عبرت آموز بنا دیتا ہے۔ خذف ریزے کو جواہر پارہ اور مٹی کو سونا بنا دینا اس کی تعبیری قوت کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔ ہمارے شعرا اسی تعبیری قوت کو معنی آفرینی، نکتہ خیزی، خیال آرائی، جدّت طرازی اور نہ معلوم اور کن کن ناموں سے موسوم کرتے ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ شام کے وقت قندیل صاف کی جاتی ہے قینچی سے بتّی تراشی جاتی ہے۔ قندیل روشن ہوتی ہے تو اس کی تیز سپید روشنی دور دور تک پہنچتی ہے۔ اب ہر طرف سے پتنگے آکر اس پر گرنے اور جلنے لگتے ہیں۔ گھریلو زندگی کا یہ ایک معمولی واقعہ ہے جو روزانہ ہر شخص کے مشاہدہ میں آتا ہے۔ اگر انتہا پسند حقیقیئین کے اصرار کے مطابق تعبیر و تشریح یا ذاتی رائے زنی سے کام لئے بغیر نفس واقعہ کو من و عن بیان کردیا جائے تو اس میں کوئی ادبی خوبی یا لطف و دلکشی پیدا نہ ہوگی لیکن جب میر تقی میر جیسے ماہر فن کی تعبیری قوت روبکار آتی ہے تو یہی ادنیٰ واقعہ لازوال ادبی جواہر پارہ بن کر ہماری آنکھوں میں خیرگی پیدا کرنے لگتا ہے۔ شعر ملاحظہ ہو۔

مر گیا بیچارہ آخر دیکھی پروانے کی بات
شمع کو گلگیر چھیڑے تھی ہی مرجانے کی بات

قطب نما کس نے نہیں دیکھا ہے؟ اس کی سوئی کو ایک آن بھی قرار نہیں ہر وقت تھرکتی رہتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مرغ بسمل تڑپ رہا ہے۔ اس پر سودا کی تعبیر ملاحظہ ہو۔

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

گھڑی کے کھٹکے۔ دھوبی کے چھوا چھو جھینگر کے جنازے۔ دیا سلائی اور مچھر وغیرہ جیسے ادنیٰ موضوع پر خواجہ حسن نظامی کے مضامین پڑھیے اگر آپ مست ہو کر جھومنے نہ لگیں تو ہمارا ذمہ۔ یہ لطف و دلکشی ان میں کہاں سے آئی؟ اس کا راز آپ کو خواجہ صاحب کی غیر معمولی تعبیری قوت میں مضمر ملے گا موپساں (MAUPASSANT) نے سیاہ دھاگہ نیلی چھتری اور مٹی کے پیالہ پر اعلیٰ درجہ کے افسانے لکھ ڈالے ہیں جن کی ساری کامیابی و اثر آفرینی تعبیر و تشریح ہی کی رہین منت ہے غرض کہ تعبیر و تشریح کی قوت ادنیٰ سے ادنیٰ واقعہ اور معمولی سے معمولی چیز کو نہایت معنی خیز، دل کش اور پرتاثیر بنا سکتی ہے لیکن تعبیر و تشریح یا شخصی نقطۂ نظر یا ذاتی رائے زنی کے استعمال کے متعلق نامور حامیانِ حقیقت کی رایوں میں سخت اختلاف پایا جاتا ہے چنانچہ بالزاک اس کا زبردست مؤید اور زولا سخت مخالف ہے ہاولز کی رائے مبہم و مذبذب ہے ایک جگہ وہ رقم طراز ہے کہ "حقیقت نگار مصنف زندگی کے ہر واقعہ پر نظر رکھتا ہے۔ اور اس میں کوئی نہ کوئی مفید مطلب معنی پنہاں پاتا ہے جس کا اظہار ضروری امر ہے وہ زندگی کے کسی معاملہ کو حقیر و بیکار تصور نہیں کرتا کیونکہ تمام چھوٹے بڑے واقعات و معاملات کے مجموعی اثر سے انسان کی قسمت اور سیرت تشکیل پاتی ہے ظاہر ہے کہ زندگی کے بہت سے جزئی امور جو بظاہر کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ اسی وقت مفید و معنی خیز بن سکتے ہیں جب تعبیر و تشریح سے کام لیا جائے لیکن یہی ہاولز۔ بالزاک پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "وہ ذاتی نقطۂ نظر سے بہت کام لیتا ہے اپنے افسانوی رجال کی سیرتوں کی تشریح کرتا جاتا ہے اور ان کو خود سے بولنے نہیں دیتا"۔ اس میں شک نہیں کہ حقیقیین کے درمیان یہ ایک مابہ النزاع مسئلہ ہے۔

انسانی زندگی کے تاریک پہلو بھی ہوتے ہیں اور روشن پہلو بھی عام طور پر ادبیات میں زندگی کے تاریک و کثیف پہلوؤں کا ذکر ترک کر دیا جاتا ہے لیکن فرانسیسی مصنف بالعموم اخلاقی نقطۂ نظر کی کچھ پروا نہیں کرتے۔ وہ اپنے افسانوی کردار کی معصیت کاریوں کو بھی ویسی ہی بیباکی سے بیان کر دیتے ہیں جیسے ان کے روشن کارناموں کو۔ ان کا خیال ہے کہ افسانہ نویس کو زندگی کی مکمل تصویر پیش کرنی چاہیئے۔ اگر زندگی کے صرف روشن پہلو دکھائے جائیں اور تاریک پہلو ترک کر دیئے جائیں تو لامحالہ تصویر ناقص اور ادھوری رہے گی نتیجہ یہ ہے کہ ان کے افسانوی لٹریچر میں بہت سی حیا سوز اور مخربِ اخلاق باتیں راہ پا گئی ہیں۔ اس عریاں نگاری کو وہ "تحریکِ فطریت" (NATURALISM) سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کے حامی "فطریین" (NATURALISTS) کہلاتے ہیں۔

بہر حال حقیقت نگاری کے اس کثیف عنصر سے مختصر قصوں اور افسانوں کا دامن ملوث نہیں ہو سکتا کیونکہ عریاں نگاری کے جواز و حمایت

میں صرف یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ افسانہ نویس کو مکمل زندگی کی ترجمانی کرنی چاہیئے۔ اس لئے اگر تاریک وکثیف امور کا ذکر ترک کر دیا جائے تو زندگی کا نقشہ ناقص و نامکمل رہے گا لیکن مختصر قصہ نویسی کو تو مکمل کردار نگاری کا دعویٰ ہی نہیں چھوٹے قصوں اور افسانوں کا اختصار اس بات کا مقتضی ہے کہ زندگی کے کسی خاص پہلو پر روشنی ڈالی جائے۔ البتہ اس خاص پہلو کا انتخاب مصنف کے مذاق پر منحصر ہوگا۔ کوئی شخص زندگی کے تمام روشن پہلوؤں کو ترک کر کے صرف کسی غلیظ و گندہ پہلو پر بحث کرے تو یہ اس کی بدمذاقی اور کثافتِ باطنی کی دلیل ہو۔ الغرض مختصر افسانہ نویسی کے حدود و شرائط نے اسے عریاں نگاری یا "تحریک فطریت" کی گندگی سے پاک رکھا ہے۔

زولا نے حقیقت نگاری کا جو مفہوم پیش کیا ہے اس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ اس قسم کی خالص حقیقیت عملاً ناممکن ہے کیونکہ یہاں انفرادی نقطۂ نظر یا تعبیر و تشریح کی گنجائش نہیں رکھی گئی ہے۔ جتنی چیزیں ہمارے تجربہ و مشاہدہ میں آتی ہیں ان سے ہماری مجموعی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے لیکن جب تک ان میں شخصی عنصر شامل نہ ہو ہمارے لٹریچر کو ان سے کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ ہر مصنف کو چاہیئے کہ وہ تعبیر و تشریح سے کام لے ورنہ عکسی تصویر کی طرح لٹریچر بھی جسدِ بے جان بن جائے گا۔ کسی ادیب یا مصنف کو تعبیر و تشریح سے مفر نہیں کیونکہ وہ انھیں تجربات کی تہ میں ترجمانی کرتا ہے جو اس کی دانست میں کوئی خاص معنی یا اہمیت رکھتے ہیں۔ اسی معنی یا اہمیت کا انکشاف و تشریح لٹریچر کی جان ہے۔ جو تجربہ کوئی قدر و قیمت یا معنی و اہمیت نہ رکھتا ہو اس کو ادبی شان و عظمت عطا کرنے اور اس طرح زندۂ جاوید بنانے کی زحمت کون گوارا کرے گا؟

علاوہ بریں افسانہ میں صداقتِ مطلق کو جگہ نہیں مل سکتی جس کا تقاضا ہے کہ زندگی کے تمام چھوٹے بڑے واقعات اور جزئی و کلی امور بے کم و کاست بیان کر دیئے جائیں۔ افسانہ نگار کو ترک و انتخاب۔ رد و بدل۔ ترمیم و اضافہ۔ قطع و برید اور حک و اصلاح سے کام لینا پڑتا۔ وہ اہم واقعات کا انتخاب کرتا ہے غیر ضروری تفصیلات سے احتراز کرتا ہے حسبِ ضرورت اپنے دل سے بھی بعض باتیں گھڑتا ہے۔ ربط و تسلسل قائم کرنے کے لئے بے تعلق امور کو چھوڑ دیتا ہے بلطف و دلکشی کی غرض سے تصویر میں تخیل کا رنگ بھی بھرتا ہے۔ کیا ایسا کرنے سے وہ موا... تکذیب کرتا ہے؟ اگر کوئی اسے کذب کہے تو کہنے دو۔ یہ جائز کذب ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعہ سے ایک ایسی اعلیٰ تخیلی صداقت حاصل ہے جو ٹھیٹھ حقیقت و واقعیت سے کہیں برتر و ارفع ہے اور جو افسانہ نویسی کے منشائے عین مطابق ہے۔ یہ بھی ذہن نشین رہے کہ حقیقت کلی حاصل نہیں ہو سکتی جب تک ہمارے کسی انفرادی تجربہ کا تعلق گزشتہ اور آیندہ واقعات کے ساتھ نہ دکھایا جائے۔ یا جب تک یہ نہ بتایا جائے کہ انسانوی رجال کی سیرت سے اس کا کیا لگاؤ ہے لیکن اس کے لیے بھی تعبیر و تشریح کی ضرورت ہے۔

جب ناول میں تعبیر و تشریح کی اس قدر ضرورت ہے تو مختصر افسانہ کا تو کچھ پوچھنا ہی نہیں وہ تو اس کے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ... زندگی کے تمام پہلوؤں پر غیر جانب داری کے ساتھ بحث کرنا یا زندگی کی مکمل تصویر پیش کرنا مختصر افسانہ نویسی کے اغراض و مقاصد سے خارج۔ وہ توحیاتِ انسانی کے کسی ایک ہی پہلو پر روشنی ڈالتی اور اس کی تعبیر و تشریح کرتی ہے مختصر افسانہ خواہ سادہ ہو یا پیچیدہ تفصیلی ہو یا اجمالی... مثالیت سے دست بہ داماں ہو یا دست و گریباں لیکن ہر حال میں وہ تعبیر و تشریح یا ذاتی نقطۂ نظر کا محتاج ہوگا مختصر قصوں اور افسانوں میں یہ تم...

حقیقیت بہترین رومانیت اور بہترین مثالیت تینوں کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ افسانہ نویس تینوں تحریکوں کو اپنی ملک سمجھتا اور ان سے یکساں طور پر استفادہ کرتا ہے۔ افسانہ نویس کا اعلیٰ مقصد واضح و مفروں شکل میں فطرتِ انسانی کے ان اصول و قوانین کو ظاہر کرنا ہے جن کی کارفرمائیوں سے ہماری سیرت و قسمت۔ رفتار و کردار۔ جذبات و احساسات خیالات و افکار اثر پذیر ہوتے ہیں۔ ایک باکمال افسانہ نویس کی نظر ہمیشہ زندگی کی اساسی صداقتوں پر رہتی ہے۔ لیکن لوگوں کی دلچسپی کے لیئے وہ ان صداقتوں کی تشریح قصہ کے پیرایہ میں کرتا ہے کیونکہ مجرد منطقی بحث میں عوام کی دلچسپی کا سامان مفقود ہوتا ہے تب۔ افسانہ سے فطرت بشری کے اساسی اصول کی تشریح نہ ہو سکے وہ طوطے مینا کی کہانی سے زیادہ وقیع نہیں کہلا سکتا ◆

محمد حسین ادیب

لغاتِ انسانی

خوشامدی:۔ جس کی سب سے زیادہ ضرورت پڑتی ہے ایک حسین عورت کو۔ ایک مصنف کو اور ایک سیاست دان کو۔

نصیحت:۔ دل کی بیماری کی ایک دوائی۔ ایک چیز جسے وکیل بیچتے ہیں۔ سائیں مفت میں دیتے ہیں اور ہمارے دوست تم پر دے مارتے ہیں۔ اچھی نصیحت وہ ہے جو بوڑھے آدمی جوانوں کو کریں۔ جب وہ خود ان کے آگے بری مثال قائم کر سکنے کے قابل نہ رہیں۔

عمر:۔ پیدائش اور موت کے درمیان نہ ٹھہرنے والی ریل گاڑی!

حیا:۔ ایک دقیانوسی لفظ جس کے استعمال کی اب ضرورت باقی نہیں۔

گولہ:۔ وہ بادشاہ جس کی حکمرانی عالمگیر ہے۔

غیر مہذّب:۔ یہ ان قوموں کا نام رکھا گیا ہے جو اپنی غلطیوں اور برائیوں کو کسی خوش نما لباس کے نیچے چھپا نہ سکیں!

"کتابی کیڑا"

کلجگ کتھا[۱]

(۱)

سکھ کے سندر سیج پہ تم نے سیکھا مست پڑے رہ جانا
کھانا سونا ہنسنا گانا چین منانا جی بہلانا
چال چلی دنیا البیلی۔ کوسوں آگے بڑھا زمانہ

(۲)

بُرا سمے آرام میں بھولے سستی میں سیکھا گھبرانا
غیرت کھوئی۔ لاج گنوائی۔ راس نہ آیا پلک[۲] لگانا
چال چلی دنیا البیلی۔ کوسوں آگے بڑھا زمانہ

(۳)

اب تک وہی پُرانی باتیں، رنگ رویّہ وہی پُرانا
وہی پرانی چال ڈھال ہے، وہی پُرانا راگ ربانا[۳]
چال چلی دنیا البیلی۔ کوسوں آگے بڑھا زمانہ

(۴)

کوئی مذہب کا متوالا، شہرت کا کوئی دیوانہ
دھن دولت کا لوبھی کوئی ذات کے ہاتھوں کوئی بکانا[۴]
چال چلی دنیا البیلی: کوسوں آگے بڑھا زمانہ

۱؎ "کلجگ کتھا" کے مجازی معنی اردو میں "شہر آشوب" کے ہوں گے۔
۲؎ "پلک لگانا" یعنی جھپکی لینا۔ اونگھنا یا سونا۔
۳؎ "ربانا" ایک باجہ ہوتا ہے۔ "راگ ربانا" محاورہ بھی ہے۔
۴؎ "بکانا" معنی بِک گیا۔ فروخت ہو گیا۔ بیع بالقبضہ۔

(۵)

کوئی سادھو۔ کوئی پریمی کسی نے سیکھا آنکھ لڑانا
کوئی جواری، کوئی شرابی کسی کو آیا بھنگ چڑھانا

چال چلی دنیا البیلی۔ کوسوں آگے بڑھا زمانہ

(۶)

دھوکے اور ٹھگی سے کوئی اپنا کرے مال برانا[1]
کھلے بند بے کھٹکے لوٹے جیسے چور نگر کا رانا[2]

چال چلی دنیا البیلی۔ کوسوں آگے بڑھا زمانہ

(۷)

اس دنیا میں اُس سے بڑھ کر احمق ہم نے کوئی نہ جانا
دھول جھونک کے جو آنکھوں میں سمجھے اپنے کو فرزانہ[3]

چال چلی دنیا البیلی۔ کوسوں آگے بڑھا زمانہ

(۸)

دل اُس کا پتھر سے بدتر اس مورکھ کو کیا سمجھانا
بھینس کے آگے بین جو باجے بھینس کھڑی پگرائے دانہ[4]

چال چلی دنیا البیلی۔ کوسوں آگے بڑھا زمانہ

(۹)

وہ مایا مورکھ بھی ہیں جو دمڑی پر سیکھیں اترانا
نہیں بدن پر جن کے لتّہ[5]، دھج البتّہ ہے شاہانہ

چال چلی دنیا البیلی کوسوں آگے بڑھا زمانہ

---

[1] "برانا" معنی پرایا۔ غیر کا۔ دوسرے کا۔
[2] "چور نگر کا رانا" مشہور کہانی سے متعلق ہے۔ یعنی چوروں کا سردار۔
[3] "فرزانہ" معنی گیانی۔ بھاگوان۔
[4] یہ کل مصرع ایک محاورہ مستعارہ ہے مطلب یہ ہے کہ جس طرح بھینس پر لحن و نغمہ کی کیفیت کا اثر نہیں ہوتا اسی طرح ناکارہ لوگوں پر پند و نصائح بیکار ہیں "زمین شور سنبل بر نیارد"
[5] لتّہ یعنی دھجی مطلب یہ ہے کہ "گھر میں بھونی بھانگ نہیں اور باہر مستی سوجھی ہے"

(۱۰)

مانگے گا جوتا اور ٹوپی سجن سجائے روپ
چلے نہ پاؤں نام ہے گڈّن[۱] بنے ہوئے دلّی سلطانا

چال چلی دنیا البیلی۔ کوسوں آگے بڑھا زمانہ

(۱۱)

دن بھر پھرنا شام کو آنا۔ کھانا پینا۔ اور سو جانا
کب تک آخر لگا رہے گا یوں اپنی اوقات گنوانا

چال چلی دنیا البیلی کوسوں آگے بڑھا زمانہ

(۱۲)

دھیان سے سوچو یہ بھی تو ہے لوبھ نشے کا ایک بہانا
کروگے کیا آزادی لے کر۔ اس کی حاجت ہے یہ مانا

چال چلی دنیا البیلی کوسوں آگے بڑھا زمانہ

(۱۳)

ارے تمہیں بدنام کئے ہے بات بات پر یہ تن جانا
بین۔ بگل۔ سنکھ۔ گائے گئو پر[۲] دنیا بھر میں اودھم[۳] مچانا

چال چلی دنیا البیلی کوسوں آگے بڑھا زمانہ

(۱۴)

ایسے دیس میں احمد پوری۔ جینے سے بہتر مر جانا
جہاں ذرا سی ضد پر جائز ہوویں گھر میں آگ لگانا

چال چلی دنیا البیلی۔ کوسوں آگے بڑھا زمانہ

(۱۵)

ہوش میں آؤ۔ آنکھیں کھولو۔ دیکھو لگا یہ کون زمانہ
راس نہیں آنے کا ہرگز یہ جیون کی ہنسی اُڑانا

---

۱ یہ محاورہ بھی اسی قسم کا ہے "گڈّن" یعنی کودنے والا مطلب یہ ہے کہ چلنے تو پاتے نہیں مگر نام رستم ہے۔ دلّی سلطانا یعنی دہلی کے بادشاہ۔

۲ اس سے مطلب ہے مسجدوں کے سامنے باجے کی شکایت محرم میں سنکھ کی شکایت اور بقر عید میں گائے وغیرہ کے متعلق جھگڑا ہے

۳ اودھم مچانا یعنی دنگا فساد کرنا۔ خانہ جنگی۔

چال چلی دنیا البیلی کوسوں آگے بڑھا زمانہ

(۱۶)

چھوڑو تم یہ کھینچا تانی کر دو نہ اپنوں کو بیگانہ   اگم بھری ہے دکھ کی ندیا بیچ بھنور میں ڈوب جانا

چال چلی دنیا البیلی کوسوں آگے بڑھا زمانہ

(۱۷)

اپنی قوت اور کثرت پر اپنی ہستی بھول نہ جانا   چور رہیگا جب تک دل میں نہیں ملے گا کوئی ٹھکانا

چال چلی دنیا البیلی کوسوں آگے بڑھا زمانہ

(۱۸)

تن من بارو۔ جیون وارو[1] قربانی کا ہے یہ زمانہ   رونے گانے کچھ بھی نہ ہوگا۔ یہ کہنا بھی بھول نہ جانا

چال چلی دنیا البیلی کوسوں آگے بڑھا زمانہ

(۱۹)

"سچ کا بول ہمیشہ بالا" کہتے آئے گیانی دانا   من سندر تو دنیا سندر یہ بھگتوں[2] کا جاپ[3] پرانا

چال چلی دنیا البیلی کوسوں آگے بڑھا زمانہ

(۲۰)

یہ سندیس[4] ہمارا پیارے۔ نیچ اونچ سب کو پہنچانا   من ہو نرمل[5]۔ دل ہو سچا۔ آپس کا برتاؤ سہانا

چال چلی دنیا البیلی کوسوں آگے بڑھا زمانہ

(۲۱)

اے جگ داتا، انتریامی، تو جو چاہے کر بھگوانا[6]   آتم تو بھی[7] ہند دیش پر مایا گھیرے تانا بانا

چال چلی دنیا البیلی کوسوں آگے بڑھا زمانہ

مقبول احمد پوری

---

[1] "وارو" معنی قربان کرو۔ [2] "بھگتوں کا" یعنی اہل دل صلح کل لوگوں کا [3] "جاپ" معنی وظیفہ۔ ورد یعنی مقولہ یا رٹ وغیرہ

[4] "سندیس" معنی پیام [5] "نرمل" معنی صاف۔ [6] "بھگوانا" معنی اے بھگوان۔ اے قسام ازل۔

[7] "آتم تو بھی" یعنی روحانیت کا شیدائی۔

ریچھ

(ڈراما)

افرادِ تمثیل

یے لینا ایوانوفنا پوپوف:- (ایک بیوہ اور صاحبِ جائداد)

گرگیری سٹی پنیچ سمرنوف:- (متوسط عمر کا زمیندار)

لیوکا:- (مادام پوپوف کا بوڑھا نوکر)

منظر:- مادام پوپوف کا کمرہ۔

مادام پوپوف (ماتمی لباس پہنے ایک تصویر پر نظریں جمائے ہے) اور لیوکا (خادم)

لیوکا۔ مادام یہ درست نہیں ـــــ آپ اپنے ہاتھوں اپنی جان لے رہی ہیں ـــــ باورچن اور ماما دونوں جنگل میں بیر چننے کے لئے گئی ہیں۔ ہر ذی روح زندگی سے لطف اٹھا رہا ہے حتیٰ کہ معمولی سی بلی بھی جانتی ہے کہ کس طرح خوش و خرم رہا جا سکتا ہے ـــــ وہ اس وقت پرندے پکڑنے میں مشغول ہے اور آپ تمام دن بند کمرے میں قید رہتی ہیں جیسے کوئی راہبہ ہو ـــــ آپکے لئے کسی چیز میں بھی لطف نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں اگر ذرا خیال تو کیجئے۔ ایک سال سے کیا کم عرصہ ہوا ہوگا جب سے آپنے دہلیز کے باہر قدم تک نہیں رکھا!

مادام پوپوف۔ اور میں ہرگز گھر سے باہر نہ نکلوں گی ـــــ آخر کیوں نکلوں؟ میری زندگی ختم ہو چکی ہے۔ وہ قبر میں مدفون ہے! اور میں نے اپنے آپ کو گھر کی چار دیواری میں دفن کر لیا ہے ـــــ ہم دونوں مر چکے ہیں۔

لیوکا۔ وہ پھر وہی قصہ! میں اسے سننا پسند نہیں کرتا نکولی رحلت کر چکا ہے اور یہ اٹل بات تھی ـــــ خدا کی مرضی میں کسی کو کیا دخل ـــــ خدا مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے! ـــــ آپ نے ماتم کیا اور بس یہی کافی ہونا چاہیئے ـــــ یہ ماتمی لباس اور رونا دھونا تا عمر قائم نہیں رہ سکتا ـــــ

میں اپنی بڑھی عورت کو مٹی دے چکا ہوں ——— میں نے
غم کیا اور ایک ماہ کے قریب اس کی جدائی میں روتا رہا ———
اس قدر ماتم اس کے لئے کافی تھا۔ اور اگر میں تمام عمر گریہ وزاری میں
گزارتا تو وہ بڑھی عورت اتنے ماتم کے قابل نہ تھی (آہ بھرتا ہے)
آپ اپنے پڑوسیوں کو بھول گئی ہیں۔ ملاقاتیوں سے ملنا ترک کر دیا
ہے۔ اگر میں یہ کہوں تو بجا ہے کہ ہم چمگادڑوں کے مانند ہیں --
ہم دن کی روشنی کو نہیں دیکھتے ——— چوہوں نے میرے کپڑوں
کو کتر ڈالا ہے . . . اس طرح تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ
آپ کے گرد ونواح میں کوئی اچھا ملنے والا شخص ہے ہی نہیں حالانکہ
تمام قصبہ شرفاء سے بھرا ہے ——— ہمارے پڑوس ہی میں ایک
رجمنٹ ہے۔ دکھیا آنکھوں کے لئے ایک روح پرور نظارہ! خیمہ
میں ہر جمعہ کے روز رقص ہوتا ہے۔ اور باجہ تو ہر روز ہی بجتا ہے
——— آہ! میری عزیز مادام! آپ جوان ہیں اور خوبصورت
بھی ——— گلاب کے پھول کی طرح حسین ——— آپ کو صرف زندہ
بنا اور زندگی سے لطف اٹھانا ہی سزاوار ہے ——— حسن تا دیر
قائم نہیں رہ سکتا ——— یہ آپ کو معلوم ہی ہے۔ دس سال کے
بعد شاید آپ طاؤس کے مانند خوش ہونا چاہیں مگر پھر یہ وقت
نصیب نہ ہوگا . . . .

مادام پوپوف۔ میں تم سے درخواست کرتی ہوں کہ
آئندہ مجھ سے ایسی گفتگو نہ کیا کرو۔ تمہیں معلوم ہے کہ نکولی کی وفات
کے بعد زندگی کی قدر و قیمت میری نگاہوں میں باقی نہیں رہی
تمہیں بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ میں زندہ ہوں مگر یہ صرف فریب نظر
ہے! میں قسم کھا چکی ہوں کہ یہ سیاہ لباس میرے تن سے ہرگز جدا
نہ ہوگا اور نہ میری نظریں بیرونی دنیا کا مطالعہ کریں گی ———
کیا سنتے ہو؟ خدا کرے کہ اس کی روح میری محبت کا مشاہدہ
کر رہی ہو! ——— ہاں! اور میں جانتی ہوں کہ یہ بات تم سے
پوشیدہ نہیں --- وہ اکثر میرے ساتھ بدسلوکی سے پیش آتا
تھا ——— ظالم اور ——— اور حتیٰ کہ بے وفا تھا! مگر میں آخری
لمحہ تک وفا کے دامن کو نہ چھوڑوں گی اور اسے بتا دوں گی کہ میں
اپنی محبت میں کہاں تک ثابت قدم ہوں ——— قبر کی تاریک
چار دیواری میں بھی وہ اس حقیقت سے غافل نہیں رہے گا کہ میں ہمیشہ
وہی رہی جو اس کی موت سے قبل تھی۔

لیوکا۔ اس قسم کی گفتگو کرنے سے یہی بہتر ہے کہ آپ باغ
میں چہل قدمی کے لئے چلی جائیں۔ یا ٹوبی اور جائنٹ کو گاڑی
میں جوت کر اپنے پڑوسیوں سے مل آئیں . . .

مادام پوپوف۔ (رونے لگ جاتی ہے)

لیوکا۔ میری عزیز مادام! کیا ہوا؟ ———

مادام پوپوف۔ وہ ٹوبی کا بہت مشتاق تھا۔ جب کبھی
وہ باہر جاتا تو اسی گھوڑے کی سواری کیا کرتا تھا ——— آہ! وہ
کیسا خوبصورت سوار تھا ——— اس کی انگلیوں میں کس غضب
کی رعنائی تھی۔ جب وہ گھوڑے کی لگام کو اپنے پورے زور کے
ساتھ کھینچا کرتا تھا ——— کیا تمہیں یاد ہے ٹوبی! ٹوبی! ———
گاڑی بان سے کہہ دینا کہ آج اسے ایک سیر دانہ زیادہ دیا
جائے۔

لیوکا۔ بہت خوب مادام (زور سے گھنٹی بجتی ہے)

مادام پوپوف۔ (چونک پڑتی ہے) دیکھو کون ہے؟

کہہ دینا کہ میں کسی سے ملاقات نہیں کیا کرتی

لیوکا ۔ بہت اچھا مادام (باہر چلا جاتا ہے)

مادام پوپوف ۔ (تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے) نکولس تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ میں کس طرح محبت میں معاف کر سکتی ہوں ——— میری محبت صرف اسی صورت میں مر سکتی ہے کہ جب میرا دل پہلو میں حرکت کرنا بند کر دے (روتے ہوئے ہنس دیتی ہے) اور کیا تم شرمندہ نہیں ہو؟ ——— میں نیک لڑکی ہوں ——— ایک باوفا بیوی۔ میں نے اپنے آپ کو قید کر لیا ہے۔ اور تمھاری محبت میں تا دمِ آخر ثابت قدم رہوں گی۔ اور تم ——— کیا شرمندہ نہیں ہو۔ تم گلگلے؟ تم نے مجھے دھوکا دیا۔ بیسیوں مرتبہ مجھ سے لڑے جھگڑے۔ مجھے چھوڑ کر ہفتوں باہر رہے ———

(لیوکا گھبرایا ہوا داخل ہوتا ہے)

لیوکا ۔ مادام! آپ سے کوئی صاحب ملنے آئے ہیں ——— ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔

مادام پوپوف ۔ مگر کیا تم نے اس سے کہا نہیں کہ میں نے اپنے خاوند کی وفات کے بعد ہر ملاقاتی سے ملنا ترک کر دیا ہے؟

لیوکا ۔ میں نے ان سے کہا مگر وہ سنتے ہی نہیں۔ کہتے ہیں کہ گفتگو اشد ضروری ہے۔

مادام پوپوف ۔ میں کسی سے نہیں ——— مل سکتی!

لیوکا ۔ میں نے یہی الفاظ اس سے کہے تھے مگر ——— وہ تو ایک مکمل شیطان معلوم ہوتا ہے گالیاں بکتا ہوا وہ کمرے میں گھس آیا ہے ——— اور اب کمرۂ طعام میں موجود ہے۔

مادام پوپوف (رنگ آکر) اچھا! اسے کمرے میں بھیج دو۔ کس قدر غیر مہذبانہ فعل ہے!

(لیوکا چلا جاتا ہے)

مادام پوپوف ۔ یہ لوگ کس قدر تنگ کرنے والے ہیں! آخر انھیں مجھ سے مطلب؟ وہ میرے آرام میں کیوں مخل ہوتے ہیں؟ (آہ بھرتی ہے) معلوم ہوتا ہے کہ اب مجھے واقعی کسی خانقاہ میں دن گزارنے پڑیں گے . . . (سوچتی ہے) ہاں! ——— خانقاہ میں

(لیوکا سمرنوف سمیت داخل ہوتا ہے)

سمرنوف (داخل ہوتے وقت لیوکا سے، اندھی کھوپڑی تو بہت باتونی معلوم ہوتا ہے! گدھا کہیں کا! (مادام پوپوف کو دیکھ کر وقار سے) مادام! میں آپ سے متعارف ہونے کا فخر حاصل کرتا ہوں ——— گریگوری ستی پینچ سمرنوف زمیندار اور سابق فوجی لفٹنٹ ——— میں ایک نہایت ضروری معاملے کے سلسلے میں آپ کو تکلیف دینے پر مجبور ہوں۔

مادام پوپوف ۔ (ہاتھ پیش نہ کرتے ہوئے) میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں۔

سمرنوف ۔ آپ کے مرحوم شوہر میرے ملنے والے تھے! انکی طرف دوبلوں کے سلسلے میں میرے بارہ ہزار روبل نکلتے ہیں چونکہ مجھے کل ساہوکارہ بنک میں سود کی ایک رقم داخل کرنا ہے۔ اسلیئے میں آپ کو یہ تکلیف دینے پر مجبور ہوں کہ وہ روپیہ مجھے آج عنایت کر دیا جائے۔

مادام پوپوف ۔ بارہ ہزار! . . . . . میرے خاوند نے آپ سے یہ روپیہ کس غرض کے لئے قرض لیا تھا؟

سمرنوف ۔ گھوڑوں کا دانہ خریدا تھا۔

مادام پوپوف ۔ (آہ بھرتے ہوئے لیوکا سے) لیوکا! جولنا مست! آج ٹوبی کو ایک سیر زائد دانہ ملے (لیوکا چلا جاتا ہے۔ سمرنوف سے) اگر نکولی کے ذمے آپ کے کچھ روپے ہیں تو میں یقیناً وہ ادا کردوں گی ـــــ مگر آج مجھے معاف فرمائیے میرے پاس فی الحال اتنی رقم موجود نہیں۔ خانساماں پرسوں تک شہر سے واپس آجائے گا میں اس سے کہہ دوں گی کہ آپ کا روپیہ ادا کردے مگر اس سے پہلے میں آپ کے لئے کچھ بھی نہیں کرسکتی ـــــ اس کے علاوہ آج میرے خاوند کو وفات پائے پورے سات ماہ ہوتے ہیں اور میں اس وقت اس حالت میں نہیں ہوں کہ روپے کے معاملے میں کسی قسم کی گفتگو کرسکوں۔

سمرنوف ۔ اور میں اس حالت میں ہوں کہ اگر کل روپیہ ادا نہ ہوسکا تو مجھے اپنے دماغ میں پستول کی گولی اتارنا پڑے گی ـــــ وہ میری جائداد فروخت کردیں گے۔

مادام پوپوف ۔ پرسوں آپ کو روپیہ مل جائیگا۔

سمرنوف میں روپیہ پرسوں نہیں بلکہ آج چاہتا ہوں۔

مادام پوپوف اگر میرے پاس روپیہ موجود نہ ہو تو میں کیا کرسکتی ہوں؟

سمرنوف ۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ آپ ادا نہیں کرسکتیں؟

مادام پوپوف ۔ نہیں!

سمرنوف ۔ ہوں! کیا آپ کا آخری جواب یہی ہے؟

مادام پوپوف ۔ جی ہاں!

سمرنوف ۔ آخری؟ ـــــ بالکل آخری؟

مادام پوپوف ۔ بالکل آخری!

سمرنوف ۔ بہت بہت شکریہ۔ مجھے یہ بات یاد رہیگی (شانوں کو جنبش دیتا ہے) اور پھر مجھ سے یہ توقع ہے کہ میں خاموش رہوں! ابھی ابھی محکمۂ آبکاری کے افسر نے مجھ سے دریافت کیا تھا "مگر یگری تم ہر وقت خشمآلود کیوں رہتے ہو؟" اپنی جان کی قسم! یہ غصہ کیونکر ضبط ہوسکتا ہے؟ ـــــ مجھے روپوں کی اشد ضرورت ہے میں اسی جستجو میں پرسوں دن چڑھنے سے پہلے گھر سے روانہ ہوتا ہوں اور ہر قرض دار کے گھر پر دستک دیتا ہوں مگر کچھ وصول نہیں ہوتا۔ اب ذلیل کتے کی مانند تھک کر چور ہوگیا ہوں خدا معلوم رات کہاں بسر کی تھی ـــــ ایک یہودی کے شراب خانے میں وڈکا[۱] کے پیپے کے ساتھ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آخر یہاں پہنچتا ہوں یعنی گھر سے پورے پچاس میل دور۔ یہ امید لیے کہ مجھے روپیہ مل جائے گا مگر یہاں دماغی توازن درست نہ ہونے کا عذر پیش کیا جاتا ہے! ـــــ آخر میں اپنی طبیعت پر کس طرح قابو پاسکتا ہوں؟

مادام پوپوف ۔ مجھے یاد ہے کہ میں آپ سے ایک مرتبہ صاف طور پر کہہ چکی ہوں کہ خانساماں کی واپسی پر آپ کو روپیہ ادا کردیا جائے گا۔

سمرنوف ۔ میں آپ سے گفتگو کرنے آیا ہوں نہ کہ خانساماں سے! ـــــ مجھے اس شیطان ـــــ بے ادبی معاف ـــــ

---

[۱] روسی شراب۔

مجھے آپ کے خانساماں سے کیا غرض ؟

مادام پوپوف۔ معاف فرمائیے جناب میں اس قسم کے الفاظ اور لب ولہجہ کی عادی نہیں ہوں ——— میں آپ سے گفتگو کرنا نہیں چاہتی (جلدی سے باہر چلی جاتی ہے)

سمرنوف۔ اپنی جان کی قسم! دماغی توازن! اس کے خاوند کو مرے سات مہینے ہو چکے ہیں۔ . . . مگر آیا مجھے سود ادا کرتا ہے یا نہیں ؟ ——— اس میں کوئی شک نہیں کہ تمھارا خاوند مر چکا ہے۔ تم غم کی حالت میں ہو! اور اسی طرح کی دیگر فضولیات میں گرفتار ہو۔ تمھارا خانساماں کہیں گیا ہوا ہے۔ جہنم میں جائے! ——— مگر میں کیا کروں ؟ ——— کسی غبارے پر سوار ہو کر قرض خواہوں سے بھاگ جاؤں ؟ یا دیوار سے سر پھوڑ کر مر جاؤں ؟ میں گرزدوف کے ہاں گیا ——— گھر پر نہیں ہے یاروشیوچ چھپا ہوا تھا۔ کرٹسین کے ساتھ جھگڑا ہوا۔ اور مار پیٹ تک نوبت پہنچ گئی۔ مازدوف بیمار تھا۔ اور اس کی طبیعت ناساز تھی۔ ان تمام کمبختوں میں سے کسی ایک نے بھی پھوٹی کوڑی تک ادا نہیں کی! صرف اس لئے کہ میں ان سے نرمی کے ساتھ پیش آتا ہوں ——— اس لئے کہ میں بے وقوف ہوں، گیا گزرا بڑھا! میں نے ان کے ساتھ بہت مہذبانہ اور نرم سلوک کیا ہے۔ مگر ٹھہرو تو سہی۔ میں تمھیں بتا دوں گا کہ کیا کر سکتا ہوں تم اب مجھے بے وقوف نہیں بنا سکو گے! میں یہاں اس وقت تک جما رہوں گا جب تک کہ یہ مجھے روپیہ ادا نہ کر دے ——— آف! آج میری طبیعت کس قدر جوش کھا رہی ہے ——— غصہ کی انتہا یہ ہے کہ سانس مشکل سے چل رہا ہے ——— آف! لعنت! میں تو ابھی سے اپنے آپ کو بیمار محسوس کر رہا ہوں (چلاتا ہے) ارے، کوئی ہے ؟

(لیوکا آتا ہے)

لیوکا۔ کیا ہے ؟

سمرنوف۔ تھوڑا سا پانی یا شراب لاؤ۔

(لیوکا چلا جاتا ہے)

سمرنوف۔ یہ بھی خوب منطق ہے! ایک شخص کو روپے کی سخت ضرورت ہے ——— اس کے پاس پھوٹی کوڑی تک موجود نہیں اور یہ صرف اس لئے ادا نہیں کر سکتی کہ اس وقت اس حالت میں نہیں ہے کہ روپے کے معاملے میں گفت و شنید کر سکے! عورتوں کی منطق کی نمایاں مثال! یہی وجہ ہے کہ میں عورتوں سے گفتگو کرنا پسند نہیں کرتا۔ اور نہ میں نے آج تک پسند کیا ہے۔

میں تو کسی آتشگیر مادے کے پیپے پر بیٹھنے کو عورت کے ساتھ گفتگو کرنے پر ترجیح دوں گا! ——— آف! میں سرتاپا غصہ بن رہا ہوں ——— اس حوّا کی بیٹی نے مجھے کس قدر خشم انگیز کر دیا ہے! بس جب کبھی اس قسم کی شاعرانہ ہستی دور سے بھی دیکھ پاتا ہوں تو میری ٹانگیں غصہ کی وجہ سے کانپنا شروع کر دیتی ہیں جی چاہتا ہے کہ پکار اٹھوں "مدد" "مدد"!

(لیوکا داخل ہوتا ہے اور اسے پانی کا گلاس دیتا ہے)

لیوکا۔ مادام کی طبیعت ناساز ہے۔ اور انھوں نے ملاقاتیوں سے ملنا بند کر رکھا ہے۔

سمرنوف۔ بھاگ جاؤ!

(لیوکا چلا جاتا ہے)

سمرنوف۔ طبیعت ناساز ہے اور ملاقاتیوں سے ملنا بند

کر رکھا ہے! بہت خوب نہ ملو ...... میں اس وقت تک
یہیں رہوں گا جب تک تم مجھے روپیہ ادا نہ کر دو گی —— اگر تمھاری
طبیعت ایک ہفتہ تک درست ہو گی تو ایک ہفتہ ہی میں یہاں قیام
کروں گا۔ اگر تم ایک سال بیمار رہو گی تو ایک سال تک ہی میں یہاں
ٹھہرا رہوں گا —— مجھے اپنا روپیہ واپس ملنا چاہیے۔ میری
اچھی خاتون! تمھارے گالوں کے ننھے گڑھے اور یہ ماتمی لباس
مجھے متاثر نہیں کر سکتے! ہم سب ان گڑھوں کو اچھی طرح سمجھتے ہیں!
(کھڑکی کے پاس جا کر چلاتا ہے) سیمیون! گھوڑوں کو باہر لے جاؤ،
ہم آج نہیں جا رہے۔ اصطبل والوں سے کہہ دینا کہ ان کو دانہ کھلا دیا جائے
ارے! تم نے بائیں ہاتھ کے گھوڑے کی پھر باگ میں ٹانگ پھنس
جانے دی ہے —— وحشی کہیں کے! (بڑبڑاتے ہوئے)
خیر! اب درست ہے (کھڑکی کے پاس سے چلاتا ہے) فضا کس قدر
خراب ہے! گرمی ناقابل برداشت ہے اور کوئی شخص کوڑی تک ادا نہیں
کرتا۔ کل رات سخت بے چینی میں کاٹی ہے۔ اور اب یہ ماتمی عورت
خرابی طبیعت کا بہانہ کر رہی ہے! —— سر میں شدت کا درد ہے
۔ کیا ووڈکا ملے گا؟ —— شاید مل جائے (با آواز
بلند پکارتا ہے) کوئی ہے؟

(لیوکا داخل ہوتا ہے)

لیوکا۔ کیا ہے؟

ووڈکا کا ایک گلاس لاؤ (لیوکا باہر چلا جاتا ہے) اُف!
(بیٹھ کر اپنے کپڑوں کا امتحان کرتا ہے) عجب ہیئت بنی ہے! سر سے
پیر تک غبار سے اٹا ہوں۔ کیچڑ سے بھرا ہوا بوٹ۔ بالوں میں کنگھی نہیں
منہ کل سے نہیں دھویا۔ واسکٹ پر تنکے پڑے ہیں! اس خاتون نے
شاید یہی خیال کیا ہو گا کہ کوئی راہزن ہے (جمائی لیتا ہے) ....
اس حالت میں ملاقاتی کمرے میں داخل ہونا تہذیب کے سراسر خلاف ہے
—— مگر اس میں کیا حرج ہے! میں ملاقاتی نہیں ہوں ——
ایک قرض خواہ کے لیے ہر لباس مناسب ہے۔

(لیوکا داخل ہوتا ہے)

لیوکا۔ (گلاس دیتے ہوئے) جناب آپ آزادی سے
کام لے رہے ہیں۔

سمرنوف۔ (غصے میں) کیا؟

لیوکا۔ کچھ بھی نہیں، میں صرف ....

سمرنوف۔ کس سے گفتگو کر رہے ہو؟ چپ رہو اب!

لیوکا۔ (اپنے آپ سے) یہ ضرور کوئی نہ کوئی آفت ہے، غالباً
کوئی آندھی لے آئی ہے اسے۔

سمرنوف۔ اُف! کتنا غضبناک ہو رہا ہوں! معلوم
ہوتا ہے کہ میں تمام دنیا کو سرمہ بنا دینا چاہتا ہوں ...
طبیعت واقعی خراب ہو رہی ہے .... (پکارتا ہے)
کوئی ہے؟

(مادام پوپوف نگاہیں نیچی کئے داخل ہوتی ہے)

مادام پوپوف۔ جناب تخلیہ میں رہنے کے باعث میرے
کان بہت عرصے سے انسانی آواز کے عادی نہیں۔ اور یہ شور برداشت
نہیں کر سکتے۔ میں آپ سے نہایت مؤدبانہ گزارش کرتی ہوں کہ میرے
آرام میں مخل نہ ہو جیے۔

سمرنوف۔ میرا روپیہ ادا کر دیجیے۔ میں چلا جاؤں گا۔

مادام پوپوف۔ میں واضح الفاظ میں کہہ چکی ہوں کہ میرے پاس

اس وقت روپیہ موجود نہیں۔ پرسوں تک انتظار کیجئے۔

سمرنوف۔ میں بھی آپ سے واضح الفاظ میں عرض کرچکا ہوں کہ مجھے روپیہ کی ضرورت ہے۔ —— پرسوں نہیں بلکہ آج اگر آپ آج روپیہ نہ دیں گی تو کل مجھے اپنے آپ کو پھانسی پر لٹکانا پڑے گا۔

مادام پوپوف۔ مگر میں کیا کرسکتی ہوں جب کہ میرے پاس روپیہ موجود ہی نہیں؟ عجیب مصیبت ہے!

سمرنوف۔ تو اس کے یہ معنی ہیں کہ آپ مجھے اس وقت روپیہ ادا نہیں کرسکتیں .... نہیں کرسکتیں؟

مادام پوپوف۔ نہیں ——

سمرنوف۔ اس صورت میں میں یہیں ٹھہروں گا۔ اور اس وقت تک ٹھہرا رہوں گا جب تک مجھے اپنی رقم وصول نہ ہوجائے (بیٹھ جاتا ہے) روپیہ پرسوں ادا کیا جائے گا! بہت خوب! میں پرسوں تک یہیں بیٹھا رہوں گا —— اسی طرح جما رہوں گا۔ (پھدک کر پھر بیٹھ جاتا ہے) کیا میں اپنا سود کل ادا کرنے پر مجبور نہیں ہوں؟ یا آپ نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ میں مذاق کررہا ہوں؟

مادام پوپوف۔ جناب میں استدعا کرتی ہوں کہ اس طرح شور نہ مچایئے —— یہ اصطبل نہیں ہے۔

سمرنوف۔ میں اصطبل کے متعلق آپ سے سوال نہیں کررہا میں پوچھ رہا ہوں —— کیا میں کل اپنا سود ادا کررہا ہوں یا نہیں؟

مادام پوپوف۔ آپ عورتوں کے ساتھ مہذبانہ گفتگو کرنا نہیں جانتے۔

سمرنوف۔ میں عورتوں کے ساتھ مہذب گفتگو کرنا جانتا ہوں۔

مادام پوپوف۔ نہیں تم نہیں جانتے۔ تم غیر مہذب اور ناشائستہ انسان ہو۔ اچھے لوگ عورتوں کے ساتھ اس قسم کی گفتگو نہیں کیا کرتے

سمرنوف۔ اوہو۔ یہ تو خوب ہے! ہاں یہ تو بتایئے کہ میں آپ سے کس طرح کی گفتگو کروں؟ فرانسیسی یا کسی اور زبان میں (زیادہ غضبناک ہوکر اور زد الکنت سے) مادام! میں اس قدر خوش ہوں کہ آپ مجھے روپیہ ادا نہیں کرتیں۔ تکلیف دہی کے لئے معافی کا طالب ہوں! آج کیسا پیارا دن ہے؟ اور یہ ماتمی لباس آپ کے جسم پر کتنا بھلا دکھائی دے رہا ہے (ادب سے جھکتا ہے)

مادام پوپوف۔ یہ بہت غیر مناسب اور وحشیانہ گفتگو ہے

سمرنوف (تمسخر اڑاتے ہوئے) غیر مناسب اور وحشیانہ! میں عورتوں سے اچھی طرح گفتگو کرنا نہیں جانتا —— مادام! مجھے ان چڑیوں سے کہیں زیادہ عورتوں سے سابقہ پڑا ہے جو آپ نے اب تک دیکھی ہیں۔ میں عورتوں کے سلسلے میں تین لڑائیاں لڑچکا ہوں۔ ہاں! کبھی وہ دن تھے کہ میں بالکل بے وقوف اور ناسمجھ تھا جذباتی اور شہد کی طرح شیریں۔ بات بات پر جھکا کرتا تھا۔۔ دام الفت میں گرفتار ہوا۔ اور رنج و آلام سہے۔ چاند کی معکوس روشنی دیکھ کر آہیں بھریں ...... میں نے وارفتگی سے محبت کی۔ ہر پہلو سے ثابت قدم رہا۔ لعنت ہو مجھ پر! —— نیل کنٹھ کی طرح صنف لطیف کے حقوق پر نغمہ آرائی کرتا رہا۔ اپنی نصف دولت اس نازک جذبے کی نذر کردی —— مگر اب —— نہیں بہرحال! اب تم مجھے اپنے دام میں نہیں پھانس سکتی ہو۔ میں کافی سبق حاصل

کر چکا ہوں! کالی بھویں، مدبھری آنکھیں، لب لعلیں، چاہ غبغب، چاندنی، سرگوشیاں، خوفزدہ سانس ——— میں اب ان چیزوں کے لیئے تانبے کا ایک پیسہ تک نہیں دے سکتا۔ مادام! آپ کو علیحدہ کرتے ہوئے، تمام عورتیں خواہ وہ جوان ہوں یا بوڑھی فطرتی طور پر جلد بھڑ جانے والی، باتونی، اذیت رساں، دروغ گو، جھگڑالو اور بے رحم ہوتی ہیں ——— ان کی منطق سخت اشتعال انگیز ہوتی ہے۔ اور اس صنف کے بارے میں (اپنی پیشانی پر ہاتھ مارتا ہے) میری صاف گوئی معاف! اس فلسفی کو جو زنانہ لباس میں ملبوس ہو چڑیاں بھی سبق پڑھا سکتی ہیں! آدمی کسی شاعرانہ ہستی کو دیکھتا ہے ——— سر تا پا سپید ململ میں لپٹی ہوئی، ایک فرشتہ۔ دیوی مجسمۂ محبت! اور اگر وہ اسکی روح میں جھانک کر دیکھے تو وہ ایک حقیر مگرمچھ سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتی (ایک کرسی کا سہارا لیتا ہے۔ کرسی ٹوٹ جاتی ہے) مگر سب سے زیادہ مشتعل کرنے والی چیز یہ ہے کہ یہ مگرمچھ کسی وجہ سے خیال کرتا ہے کہ اس کی خودمختاری اور اجارہ داری ہی محبت کا جذبۂ نازک ہے! لیکن، لعنت ہو مجھ پر! ——— آپ مجھے اس کیل پر الٹا لٹکا کر پھانسی دے سکتی ہیں۔ اگر کوئی عورت سوائے اپنے پالتو کتے کے کسی اور کی محبت میں ثابت قدم رہی ہو! محبت کے دوران میں شکوہ شکایت کرنے کے علاوہ وہ اور کچھ نہیں کر سکتی۔ ——— آپ بدقسمتی سے عورت ہیں اور اس لئے عورت کی فطرت کا مطالعہ آپ اپنے آپ سے کرتی ہیں! ایمانداری سے بتائیے کہ کیا آپ نے ابھی تک کوئی ایسی عورت دیکھی ہے جو وفا شعار، ثابت قدم اور صاف دل ہو؟ ——— آپ ایسی مثال نہیں پیش کر سکتیں، ایک سینگوں والی بلی آسانی سے مل سکتی ہے۔ مگر وفادار عورت ڈھونڈے سے بھی نہیں مل سکتی!

مادام پوپوف۔ تو کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ پھر محبت میں کون ثابت قدم رہتا ہے۔ مرد تو رہ نہیں سکتے۔

سمرنوف۔ یقیناً مرد!

مادام پوپوف۔ مرد! (ہنستی ہے) مرد! محبت میں سچے اور ثابت قدم! ——— یہ تو بالکل نئی بات ہے (غصے میں) آپ کو کیا حق پہنچتا ہے کہ اس قسم کا فیصلہ مرتب کریں؟ مرد سچے اور ثابت قدم! ——— اگر اسی کے متعلق گفتگو کرنی ہے تو میرا خاوند ان تمام مردوں سے جو میرے ملنے والے تھے نسبتاً بہتر تھا ..... میں اس سے بہت محبت کیا کرتی تھی۔ ایسی محبت جو ایک نوجوان اور پاک باز عورت کر سکتی ہے۔ میں نے اپنی جوانی اس کی نذر کر دی۔ زندگی، مسرت، دولت سب کچھ حوالے کر دیا۔ وہ میرے جسم کی روح تھا۔ ایک بت تھا جس کی میں پجارن بن کر رہی ——— اور یہ مرد جو اوروں سے بہتر تھا قدم قدم پر مجھے نہایت شرمناک طریقے پر دھوکا دیتا۔ اس کی موت کے بعد مجھے میز کا ایک خانہ عشقیہ خطوط سے بھرا ہوا ملا۔ اور جب وہ زندہ تھا! . . . (اس کی یاد کس قدر دہشت خیز ہے) وہ مجھے ہفتوں کے لئے اکیلا چھوڑ جایا کرتا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے وہ بہت سی عورتوں سے اظہار عشق کرتا اور مجھ سے دغا کرتا تھا۔ میرے روپیہ کو برباد کرتا اور میرے احساسات کا مضحکہ اڑاتا تھا۔ مگر باوجود ان سب باتوں کے میری محبت میں کوئی فرق نہ آنے پایا ——— اور اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ میں اب بھی ویسی ہی ثابت قدم اور وفا کیش ہوں۔ میں نے ان چار دیواروں کے اندر اپنے آپ کو ہمیشہ کے لئے قید کر لیا ہے۔ اور اس ماتمی لباس کو میں اپنے تن سے ہرگز جدا نہ ہونے دوں گی۔

سمرنوف ۔ (حقارت سے ہنستے ہوئے) ماتمی لباس! نہ معلوم آپ نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے۔ جیسے میں کچھ جانتا ہی نہیں ہوں کہ یہ سیاہ لباس پہن کر چار دیواری میں قید رہنے سے آپ کا کیا مطلب ہے!
——— واقعی بڑا پُر اسرار ہے ——— اور رُومان انگیز! ———
اگر کوئی نوجوان مبتدی شاعر آپ کے گھر کے پاس سے گزرے گا تو وہ کھڑکیوں کی طرف دیکھ کر یہ کہے گا "یہاں وہ پُراسرار عورت رہتی ہے جس نے اپنے خاوند کی محبت میں اپنے آپ کو گھر میں قید کر رکھا ہے"
——— میں ان ہتھکنڈوں کو اچھی طرح سمجھتا ہوں

مادام پوپوف (شرم سے سرخ ہوتے ہوئے) کیا؟ تم یہ کہنے کی کیوں کر جرأت کر سکتے ہو؟

سمرنوف ۔ آپ نے اپنے آپ کو زندہ دفن تو کر لیا ہے مگر چہرے پر غازہ لگانا نہیں بھولیں!

مادام پوپوف ۔ اس قسم کی نازیبا گفتگو کی تم کیونکر جرأت کر سکتے ہو؟

سمرنوف ۔ ازراہِ عنایت شور نہ مچائیے۔ ——— میں خانساماں نہیں ہوں! مجھے حق گوئی سے کام لینے دیجئے۔ میں عورت نہیں ہوں۔ اس لئے کھری کھری بات کہنے کا عادی ہوں ——— شور نہ مچائیے گا۔ اب!

مادام پوپوف ۔ میں خاموش ہوں۔ یہ تمھیں ہو جو اس طرح چلّا رہے ہو ——— خدا کے لیے اب تم جاؤ۔

سمرنوف ۔ روپیہ ادا کر دیجئے۔ تو میں ابھی چلا جاتا ہوں

مادام پوپوف ۔ میں ہرگز نہیں دوں گی۔

سمرنوف ۔ مگر آپ کو دینا ہوگا!

مادام پوپوف تمھاری اس ضد پر میں ایک کوڑی تک بھی ادا نہ کروں گی ——— بہتر یہی ہے کہ یہاں سے چلے جاؤ۔

سمرنوف ۔ معاف کرنا تم میری بیاہتا یا منسوبہ نہیں ہو اس لئے اس قسم کا جھگڑا مت کرو (بیٹھ جاتا ہے) مجھے یہ گفتگو ایک آنکھ نہیں بھاتی۔

مادام پوپوف (غیر مہذبانہ الفاظ سن کر حیران ہوتے ہوئے) تم بیٹھ رہے ہو؟

سمرنوف ۔ ہاں! ہاں!

مادام پوپوف ۔ میں درخواست کرتی ہوں تم یہاں سے چلے جاؤ۔

سمرنوف ۔ روپیہ ادا کر دو (ایک طرف ہو کر) میں کس قدر غضبناک ہو رہا ہوں۔

مادام پوپوف ۔ میں ناشائستہ لوگوں کی گفتگو سننا پسند نہیں کرتی۔ ازراہِ عنایت یہاں سے چلے جاؤ (ذرا ٹھہر کر) کیا نہیں جاؤ گے ——— نہیں جاؤ گے؟

سمرنوف ۔ نہیں!

مادام پوپوف ۔ نہیں؟

سمرنوف نہیں!

مادام پوپوف ۔ بہت اچھا ٹھہرو (گھنٹی بجاتی ہے)

(لیوکا داخل ہوتا ہے)

مادام پوپوف ۔ لیوکا۔ اس شخص کو دروازہ دکھا دو۔

لیوکا (سمرنوف کے قریب جاتا ہے) جناب! جب آپ سے کہا گیا ہے تو آپ تشریف کیوں نہیں لے جاتے۔ یہاں ٹھہ—

میں کوئی فائدہ نہیں ——

سمرنوف (کرسی پرسے کود کر) زبان کو لگام دو! جانتے ہو کس سے گفتگو کر رہے ہو؟ —— قیمہ بنا دونگا، خیال رہے!

لیوکا۔ (اپنے دل کے مقام پر ہاتھ رکھتا ہے) خداوندا! (کرسی پر بیٹھ جاتا ہے) آہ! میں بیمار ہو رہا ہوں! بیمار ہو رہا ہوں! سانس مشکل سے چل رہا ہے!

مادام پوپوف۔ ڈاشا کہاں ہے؟ —— ڈاشا! (چلاتی ہے) ڈاشا! پیلیگیا! ڈاشا! (گھنٹی بجاتی ہے)

لیوکا۔ اُف! —— وہ بیر چننے گئی ہیں —— گھر میں کوئی بھی موجود نہیں —— طبیعت سخت خراب ہو رہی ہے، پانی!

مادام پوپوف۔ برائے مہربانی یہاں سے چلے جائیے

سمرنوف ذرا نرم گفتاری سے کام لیجئے۔

مادام پوپوف (مٹھیاں بھینچتے ہوئے اور ایڑیوں کو زمین پر مار کر) تم ریچھ ہو! —— ایک وحشی ریچھ! بکواسی! دیو!

سمرنوف۔ کیا؟ کیا کہا؟

مادام پوپوف۔ کہتی ہوں تم ریچھ ہو —— دیو ہو!

سمرنوف۔ (کھڑے ہوتے ہوئے) معاف کرنا تمھیں کیا حق حاصل ہے کہ میری اس طرح ہتک کرو؟

مادام پوپوف۔ ہاں! میں تمھاری ہتک کر رہی ہوں —— پھر کیا؟ کیا یہ سمجھ رہے ہو میں تم سے خائف ہوں؟

سمرنوف۔ اور کیا تمھارے خیال میں ایک شاعرانہ چیز ہوتے ہوئے تمھیں ہر شخص کی بے عزتی کرنے کا حق حاصل ہے؟ —— دعوتِ مبارزت قبول ہو!

لیوکا میرے اللہ! —— پانی!! پانی!!

سمرنوف پستول!

مادام پوپوف۔ اگر تم مضبوط ہاتھوں کے مالک ہو اور سانڈ کی طرح ڈکار سکتے ہو تو کیا تمھارا خیال ہے میں ڈر جاؤں گی؟

سمرنوف مبارزت کے ذریعے سے اس چیز کا فیصلہ ہو گا۔ مجھے اس کی کچھ پروا نہیں کہ تم عورت ہو —— ایک کمزور حریف!

مادام پوپوف (سمرنوف کی آواز کو دباتے ہوئے) ریچھ! ریچھ! ریچھ!

سمرنوف۔ اب وہ وقت نہیں رہا کہ صرف مرد ہی ہتک کے لئے سزا بھگتیں! اگر مساوات قائم ہونی ہے تو ابھی سے ہو گی۔ لعنت ہو سب پر! تمھیں دعوتِ مبارزت قبول کرنا ہو گی!

مادام پوپوف۔ ڈوئل چاہتے ہو؟ بہت خوشی سے!

سمرنوف۔ ابھی اسی لمحے!

مادام پوپوف۔ اسی لمحے! میرے خاوند کے پاس پستول تھے میں ابھی لاتی ہوں (باہر جاتی ہے۔ اور جلدی سے واپس چلی آتی ہے) میں کس قدر خوش ہوں گی جب پستول کی آہنی گولی تمھارے بھدے دماغ سے پار ہو گی! لعنت ہو تم پر! (چلی جاتی ہے)

سمرنوف میں اسے پرندے کی طرح آسانی سے گولی کا نشانہ بناؤں گا! دودھ پیتا بچہ نہیں ہوں، جذباتی اور رومانی انسان نہیں —— عورتوں کے غمزے اور ادائیں میری نظروں میں کچھ معنی نہیں رکھتیں۔

لیوکا میرے اچھے صاحب! (گھٹنوں کے بل کھڑا ہو کر)

خدا کے لئے اس بوڑھے آدمی پر رحم کیجئے! یہاں سے تشریف لے جائیے! میں پہلے ہی سے خوف کے مارے سر دہرا جا رہا ہوں۔ اور اب آپ لڑ رہے ہیں!

سمرنوف۔ (لیوکا کی بات پر کان نہ دھرتے ہوئے، مڑ کر) واقعی یہ مساوات ہے! اسی سے تو اصناف کی آزادی کا پتہ چلتا ہے! میں اسے گولی کا نشانہ بنا دوں گا۔ مگر کتنی بہادر عورت ہے! (اسے لعن طعن کرتا ہے) کہہ رہی تھی "لعنت ہو تم پر! تمہارے بھدے دماغ میں گولی اتار دوں گی!" ... کیسی عورت ہے! اس کے گال سرخ ہو رہے تھے، آنکھیں چمک رہی تھیں ... اس نے مقابلہ منظور کر لیا! اپنی عزت کی قسم! آج سے قبل ایسی عورت کبھی دیکھنے میں نہیں آئی! ....

لیوکا۔ اچھے صاحب! تشریف لے جائیے! میں آپ کے لئے دعا کیا کروں گا!

سمرنوف۔ وہ واقعی عورت ہے۔ مجھے یہ جرأت بہت پسند ہے! سر سے پیر تک عورت! جذبات کا شمہ بھر بھی موجود نہیں بلکہ سراپا شعلہ ہے، آتش گیر مادہ، آتش بازی کا ایک چکر! ——— اس عورت کو ہلاک کرنے کے بعد مجھے واقعی افسوس ہو گا۔

لیوکا۔ (روتا ہے) جناب! یہاں سے چلے جائیے۔

سمرنوف۔ یہ عورت مجھے پسند ہے! واقعی بہت پسند ہے! گو اس کے گالوں میں گڑھے ہیں، مگر پھر بھی وہ مجھے بہت بھاتی ہے! میں اسے تمام قرض بخش دوں گا۔ میرا غصہ کافور ہو گیا ہے ——— خوب عورت ہے!

(مادام پوپوف دو پستول لیے داخل ہوتی ہے)

مادام پوپوف۔ یہ رہے پستول ... مگر قبل اس کے کہ ہم ایک دوسرے پر گولیاں چلائیں مجھے سکھا دو کہ پستول کس طرح چلاتے ہیں ——— میں نے عمر بھر پستول کو چھوا تک نہیں۔

لیوکا۔ خدا رحم کرے! میں جا کر گاڑی والے اور باغبان کو ڈھونڈتا ہوں ——— نہ معلوم یہ تکلیف کی آندھی کہاں سے نمودار ہو گئی؟ (چلا جاتا ہے)

سمرنوف (پستولوں کا امتحان کرتے ہوئے) پستول بہت قسم کے ہوتے ہیں ——— یہ سمتھ کمپنی کے تیار کردہ ہیں ——— بہت اچھے ہیں کوئی سو سو روبل کے قریب قیمت ہو گی ... دیکھئے پستول کو اس طرح پکڑئیے گا (اپنے آپ سے) کیسی حسین آنکھیں ہیں! کیسی حسین آنکھیں ہیں! ——— ساحرہ ہے!

مادام پوپوف۔ کیا اس طرح؟

سمرنوف۔ بالکل درست ...... اب لبلبی کو اوپر اٹھائیے ... اس طرح نشانہ باندھیئے ... سر کو ہلکی سی جنبش دیجئے۔ ہاتھ کو لمبا لے جائیے ——— ٹھیک ہے ... پھر اس ننھی سی چیز کو دبا دیجئے اور بس۔ مگر خیال رہے کہ لبلبی دباتے وقت پریشانی غلبہ نہ پائے۔ اور نشانہ بڑے اطمینان سے لیا جائے۔ ہاتھ ہرگز ہرگز نہ کانپے!

مادام پوپوف۔ بہت اچھا ——— مگر یہاں اس کمرے میں لڑنا درست نہیں۔ آؤ باہر باغ میں چلیں۔

سمرنوف۔ چلو مگر میں تو صرف ہوا میں گولی چلاؤں گا

مادام پوپوف۔ وہ کیوں؟

سمرنوف۔ اس لئے —— اس لئے —— کہ یہ میری مرضی ہے۔

مادام پوپوف۔ اب ڈر رہے ہو؟ ہاہا! نہیں جناب اب میں حیل و حجت نہیں سنوں گی! مہربانی کرکے چلئے —— میں اُس وقت تک مطمئن نہیں ہوسکتی جب تک آپکے سر میں گولی نہ اتر جائے اس سر میں جس سے مجھے سخت نفرت ہے! کیا واقعی ٹال رہے ہو؟

سمرنوف۔ واقعی!

مادام پوپوف۔ سراسر جھوٹ! —— مگر تم لڑنے پر آمادہ کیوں نہیں ہو؟

سمرنوف۔ اس لئے . . . اس لئے . . . . کہ میں تمھیں پسند کرتا ہوں۔

مادام پوپوف۔ (زہریلی مسکراہٹ کیساتھ) مجھے پسند کرتا ہے! یہ کہنے کی جرأت کرتا ہے (دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) تم جاسکتے ہو!

سمرنوف۔ (خاموشی سے پستول ہاتھ سے رکھ دیتا ہے، ٹوپی اٹھاکر چلنے لگتا ہے۔ مگر دروازے کے قریب ٹھہر جاتا ہے نصف لمحہ تک وہ ایک دوسرے کی طرف خاموش نگاہوں سے دیکھتے ہیں —— مادام پوپوف کی طرف جاکر) کیا آپ ابھی تک ناراض ہیں؟ ——

مگر آپ جانتی ہیں —— آہ! میں اپنا مفہوم کس طرح ادا کروں؟ دیکھئے حقیقت یہ ہے —— یعنی معاملہ یوں ہے —— دیگر الفاظ میں (روتا ہے) مگر یہ میرا قصور نہیں ہے کہ میں تمھیں پسند کرتا ہوں (کرسی کا سہارا لیتا ہے۔ کرسی ٹوٹ جاتی ہے) لعنت! تمھارا آرائشی سامان کس قدر نازک ہے! میں تمھیں پسند کرتا ہوں؟ —— سمجھتی ہو؟ —— تمھاری محبت میں گرفتار ہوں۔

مادام پوپوف۔ دور ہو جاؤ! مجھے تم سے سخت نفرت ہے!

سمرنوف۔ میرے معبود! کیسی نادر عورت ہے۔ کم از کم آج تک میری نظر سے اس قسم کی عورت نہیں گزری —— میں برباد ہوگیا ہوں! تباہ ہوگیا ہوں! —— اس چوہے کی مانند ہوں جو پنجرہ میں گرفتار کرلیا گیا ہو!

مادام پوپوف۔ بھاگ جاؤ! ورنہ گولی چلادوں گی۔

سمرنوف۔ چلادو! آہ! تم اس مسرت کا اندازہ نہیں کر سکتیں! جو ان درخشاں آنکھوں کے سامنے مرنے سے ایک شخص کو نصیب ہوسکتی ہے —— ان مخملی ہاتھوں میں پکڑے ہوئے پستول سے ہلاک ہونا! —— دیوانہ ہوگیا ہوں! سوچ کر ابھی ابھی فیصلہ کرلو کیونکہ اگر میں ایک دفعہ یہاں سے چلا گیا تو پھر ملاقات بہت مشکل ہے! فیصلہ کرلو نا! —— میں اچھے خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ شریف آدمی ہوں۔ دس ہزار روبل ماہوار معقول آمدنی بھی ہے —— نشانے میں اتنا ماہر ہوں کہ سکہ ہوا میں اچھال کر دو ٹکڑے کرسکتا ہوں —— میرے اصطبل میں اچھے سے اچھے گھوڑے موجود ہیں —— کیا میری بیوی بننا قبول کرتی ہو؟

مادام پوپوف۔ (حقارت سے پستول کو اٹھاتے ہوئے) ڈوئل! ہمیں فیصلہ کرلینا چاہیئے!

سمرنوف۔ میں دیوانہ ہوگیا ہوں —— کچھ سمجھ میں نہیں

آتا (پکارتا ہے) کوئی ہے! پانی!

مادام پوپوف - (چلّاتی ہے) کہہ رہی ہوں ابھی فیصلہ ہونا چاہیئے!

سمرنوف میں پاگل بن گیا ہوں! ایک لڑکے کی طرح محبت میں گرفتار ہوں —— بیوقوف کی مانند! (اس کا ہاتھ پکڑتا ہے: وہ چلّاتی ہے) میں تم سے محبت کرتا ہوں گھٹنوں کے بل کھڑا ہوکر) ایسی محبت جو میں نے آج سے پہلے کسی سے نہیں کی —— بارہ عورتوں کو ٹھکرا چکا ہوں اور نو مجھے ٹھکرا چکی ہیں۔ مگر اب بالکل موم ہوا جا رہا ہوں —— کھیر کے مانند نرم! گھٹنوں کے بل گر کر تمھیں اپنا دل پیش کر رہا ہوں —— کس قدر غیر مردانہ فعل ہے! میں نے مدّت سے کسی سے دل نہیں لگایا۔ اس لیئے کہ میں حلف اٹھا چکا تھا۔ مگر یہاں شکست ہوئی جاتی ہے —— دل پیشِ خدمت ہے۔ بتاؤ۔ ہاں یا نہیں؟ —— بہت اچھا نہ سہی۔ (اٹھ کر تیزی سے دروازے کی جانب بڑھتا ہے) اچھا۔

مادام پوپوف ٹھہرو!

سمرنوف - (ٹھہر کر) کیوں؟

مادام پوپوف کچھ نہیں —— جاؤ! مگر خیر ٹھہرو تو —— نہیں نہیں، جاؤ! میں تم سے متنفر ہوں! —— نہیں! مت جاؤ! —— آہ! اگر تمھیں صرف اتنا معلوم ہو کہ میں کس قدر خشمناک ہوں! (پستول میز پر پھینک دیتی ہے) انگلیاں اس خوفناک چیز کے پکڑنے سے بے حس ہوگئی ہیں (اپنے رومال کو غصہ میں پھاڑتی ہے) کھڑے کیوں ہو؟ —— جاؤ!

سمرنوف - خدا حافظ!

مادام پوپوف - ہاں، ہاں جاؤ! (بآوازِ بلند پکارتی ہے) کہاں جا رہے ہو؟ ٹھہرو تو —— نہیں تم جا سکتے ہو —— آہ طبیعت کس قدر غصّے سے بھری ہے! نزدیک مت آنا! میرے نزدیک مت آنا!

سمرنوف (اس کی طرف جاتے ہوئے) میں اپنے آپ سے کتنا خفا ہوں! سکول کے لڑکے کے مانند محبت میں گرفتار ہوں —— گھٹنوں کے بل گرا تھا —— یہ خیال مجھے سرد کر دیتا ہے —— تم سے اس طرح محبت کرتا ہوں جیسے میں واقعی دامِ الفت میں گرفتار ہونا چاہتا تھا! —— کل مجھے سود کی رقم ادا کرنی ہے —— گھاس کا موسم شروع ہے۔ اور ان سب چیزوں سے پہلے تمھاری محبت نمودار ہوگئی ہے . . . (اس کی کمر میں بازو ڈالتا ہے) میں اپنے آپ کو ہرگز معاف نہ کروں گا!

مادام پوپوف (چلّا کر) چلے جاؤ! اپنے بازو ہٹالو! —— میں تم سے سخت متنفر ہوں —— تمھیں دعوتِ مبارزت —— قبول —— کرنا —— ہوگی (ایک لمبا بوسہ)

(لیوکا کلھاڑی سے مسلح۔ باغبان کدال پکڑے۔ گاڑیبان لوہے کا پنجہ تھامے اور مزدور لاٹھیاں اٹھائے داخل ہوتے ہیں)

لیوکا (دونوں کو بغلگیر دیکھ کر) میرے معبود!!

(ایک وقفہ)

مادام پوپوف - (آنکھیں جھکا کر) لیوکا! اصطبل میں کہہ دینا کہ ٹوبی کو ایک سیر زائد دانہ نہ دیا جائے۔

(پردہ)

سعادت حسن

جہاں ریحانہ رہتی تھی

(ایک مغربی نظم کے تاثرات)

"ہمایوں" میں یہ نظم پہلے غیر مکمل صورت میں چھپ چکی ہے۔ اب حضرت اختر شیرانی نے پوری نظم لکھ کر ہمیں عنایت فرمائی ہے۔

یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی
وہ اس وادی کی شہزادی تھی اور شاہانہ رہتی تھی
کنول کا پھول تھی سنسار سے بیگانہ رہتی تھی
نظر سے دور مثلِ نکہتِ مستانہ رہتی تھی
یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی

یہ پھولوں کی حسیں آبادیاں کاشانہ تھیں اس کا
وہ اک بت تھی۔ یہ ساری وادیاں بتخانہ تھیں اس کا
وہ اک دیوی تھی، مثلِ عظمتِ بتخانہ رہتی تھی
یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی

انہی صحراؤں میں وہ اپنے گلے کو چراتی تھی
انہی چشموں پہ وہ ہر روز منہ دھونے کو آتی تھی
انہی ٹیلوں کے دامن میں وہ آزادانہ رہتی تھی
یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی

مرے ہمدم یہ نخلستان اک دن اس کا مسکن تھا

اسی کے "خرمیٔ آغوش" میں اُس کا نشیمن تھا
وہ اس شاداب ویرانے میں بے باکانہ رہتی تھی
یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی

وہ اس ٹیلے پہ اکثر عاشقانہ گیت گاتی تھی
عرب کے جنگجوؤں کے فسانے گنگناتی تھی
یہیں پر منتظر میری وہ بے تابانہ رہتی تھی
یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی

یہ ویرانہ گزر جس میں نہیں ہے کاروانوں کا
جہاں ملتا نہیں نام و نشاں تک ساربانوں کا
اسی ویرانے میں اِک دن مری ریحانہ رہتی تھی
یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی

تمدن کی ہوا اس خاکِ اقدس تک نہ آتی تھی
یہ وہ خطہ تھا جس میں روحِ فطرت کی خدائی تھی
وہ اِس خطے میں مثلِ سبزۂ بیگانہ رہتی تھی
یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی

وہ گیسوئے پریشاں یا گھٹائیں رقص کرتی تھیں
فضائیں وجد کرتی تھیں، ہوائیں رقص کرتی تھیں
وہ اِس فردوسِ وجد و رقص میں مستانہ رہتی تھی

یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی

شمیم زلف سے اُس کی مہک جاتی تھی کل وادی
نگاہِ مست سے اُس کی، بہک جاتی تھی کل وادی
ہوائیں پُرفشاں، روحِ مے و میخانہ رہتی تھی
یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی

کھجوروں کے تلے، وہ جو کھنڈر سے جھلملاتے ہیں
یہ سب ریحانہ کے معصوم افسانے سناتے ہیں
وہ اِن کھنڈروں میں اک دن صورتِ افسانہ رہتی تھی
یہی وادی ہے وہ ہمدم۔ جہاں ریحانہ رہتی تھی

اُسے پھولوں نے میری یاد میں بیتاب دیکھا ہے
ستاروں کی نظر نے رات بھر بیخواب دیکھا ہے
وہ شمعِ حسن تھی پر صورتِ پروانہ رہتی تھی
یہی وادی ہے وہ ہمدم۔ جہاں ریحانہ رہتی تھی

یہیں مانندِ گلہائے حسیں رہتی تھی ریحانہ
مثالِ حورِ فردوسِ بریں رہتی تھی ریحانہ
یہیں رہتی تھی ریحانہ۔ یہیں ریحانہ رہتی تھی
یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی

اختر شیرانی

رنگین وادی

افق کے اُس طرف کہتے ہیں اک رنگین وادی ہے

وہاں رنگینیاں کہسار کے دامن میں سوتی ہیں
گلوں کی نکہتیں ہر چار سو آوارہ ہوتی ہیں
وہاں نغمے صبا کی نرم رو موجوں میں رہتے ہیں
وہاں آبِ رواں میں مستیوں کے رقص بہتے ہیں
وہاں ہے ایک دنیائے ترنم آبشاروں میں
وہاں تقسیم ہوتا ہے تبسم لالہ زاروں میں
سنہرے چاند کی کرنیں وہاں راتوں کو آتی ہیں
وہاں پریاں محبت کے خدا کے گیت گاتی ہیں
کنارِ آب حسن و عشق باہم سیر کرتے ہیں
کسی گذری غلط فہمی کا ذکرِ خیر کرتے ہیں
وہاں کے رہنے والوں کو گنہ کرنا نہیں آتا
ذلیل مبتذل جذبات سے ڈرنا نہیں آتا
وہاں اہلِ خرد سے نہ کوئی بغض رکھتا ہے
وہاں اہلِ محبت کو نہ کوئی نام دھرتا ہے
محبت کرنے والوں کو وہاں رسوا نہیں کرتے
محبت کرنے والوں کا وہاں چرچا نہیں کرتے
ہم اکثر سوچتے ہیں تنگ آ کر کہیں بس چل دیں
مری جاں! آ کہ ہم خوابوں کی وادی میں چل دیں

...رف کہتے ہیں اک رنگین وادی ہے





ٹوٹا ہوا برتن

فلسفۂ جمالیات

جمالیات یا فلسفۂ جمالیات پر ہمارے ہاں جسے لٹریچر کہتے ہیں نام کو نہیں۔ شاعر حسن حسن پکارا کرتے ہیں لیکن اُس کی ماہیت سے ان میں سے اکثر دبشتر لاعلم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری شاعری جہاں تک حسن و عشق کا تعلق ہے وہ بیشتر جنسی دائرے میں محدود ہو گئی اور شاعر کا زاویۂ نگاہ چہرے اور انگلیٹ سے آگے نہیں بڑھا۔ تاکہ ہمارا مطمح نظر وسیع ہو۔ اور ہماری ذہنیت کو حسن کی عالمگیری اور اُس کے ہر رنگ کا احساس ہو جس کا نتیجہ تزکیۂ نفس اور تنزۂ ذات ہے آج کی صحبت کے لئے یہ موضوع اختیار کیا گیا۔

اصل موضوع پر آنے سے پہلے یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ وہ اردو میں نیا ہے اس لئے اس تحریر میں آپ کو کئی نئے لفظ اور ترکیبیں ملیں گی۔ یہ امر ناگزیر تھا۔ کوشش یہ ہو گی کہ مشکل پسندی سے احتراز رہے اور ضرورت پر اصطلاحیں ایسی وضع کی جائیں جو عام فہم ہوں۔

یورپ کے ایک فلسفی کا قول ہے کہ عالم حواس یا اندریانہ دنیا میں جسے ہم حسن یا سُندرین کہتے ہیں وہ کسی نہ کسی طرح جنسی تعلق سے وابستگی رکھتا ہے لیکن پھولوں کی رنگ و بو سے متعلق یہ بات نہیں۔ مگر پرندوں کے ہاں ان کی رنگیلی چمک دمک اور ان کی نغمہ سرائی دونوں بقول ڈارون کے جنسی انتخاب کی نتیج ہیں اور یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بعض حشرات الارض کا رنگ و روغن بھی اسی قبیل سے تعین پاتا ہے ایک عجیب بات ذکر کے قابل یہ ہے کہ یہ خاصۂ جنسی تعلق کا جو بہترین جنسی پیداوار کی ترقی کے منشا سے عمل پیرا ہوا متعلقہ ہستیوں کو باہم دلکش بنانے کے علاوہ ہم کو بھی سہانا معلوم ہوتا ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو جنگل اور کوہسار ہماری نظروں میں سونے تھے یہ مشاہدہ بہت دلچسپ ہے کہ حسن انسانی کا تصور زیادہ تر اسی عنوان سے کیونکر پیدا ہوا

یہ خیال تعمیم پا رہا ہے کم نہیں۔ حسن کا عنصر جو جنسی تعلق سے پیدا ہوتا ہے جمالیات کے شعبوں پر اس قدر حاوی ہے یعنی۔ موسیقی۔ ناٹک افسانہ۔ اور شاعری پر کہ وہ ایک نیا جامہ پہنتا ہے جب ہم یہ تحقیق کرتے ہیں کہ وہ اندریوں کی ہستی میں کہاں تک ساری ہے۔

جو کچھ ابھی کہا گیا وہ گویا حسن کے نیچرل سائینس یعنی طبعی کیفیت و کیفیت پر مختوی تھا۔ اب تک حالت یہ رہی ہے کہ علم نفسیات ارتقا کے اصولوں کی بحث سے معصوم رہا ہے۔ اب تک اس کی نظر میں ذہنی زندگی کے مظاہر ویسے ہی منعکس رہے جیسے کہ وہ ظاہر میں ہیں۔ اس کی کوشش صرف ان کے مشاہدہ اور ادراک تک محدود رہی۔ ان کی علت غائی اور یہ کہ کون کون سے مدارج طے کر کے وہ موجودہ صورت تک پہنچے کس طرح اجمال سے تفصیل کی صورت پکڑی۔ ان کا کونسا جز معطل ہو گیا اور کونسا نہج دلو عمل کا عامل ہوا۔ ان امور کی جانب توجہ نہیں کی گئی۔

یہی حالت جمالیات کی رہی اور رہنی ہی تھی۔ کیونکہ ظاہر ہے جو تعلق اس کا نفسیات سے ہے۔ اندھا دھند اصول قائم ہوئے جو عموماً انسان کے ذہن پر چھا گئے۔ چونکہ حسن کے احساس کی جیسا کہ وہ عہدِ حاضر میں اثر گستر ہے کسی عملی تجربے یا حواس کے قابلِ ادراک طریق سے توجیہہ نہیں ہو سکتی اس وجہ سے سینکڑوں فلسفیوں نے افلاطون سے لے کر آج تک ایسے حکیمانہ دعوے پیش کئے ہیں کہ یہ احساس صرف ان منتشر مظاہر میں سے ہے جو انسان میں مافوق الانسان عنصر کا پتہ دیتے ہیں۔

اس فلسفیانہ بحث کو یہیں چھوڑیئے اور جمالیات کے مسئلہ پر دوسرے پہلو سے نظر ڈالئے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے نظام افلاک، زمانہ، فضا اور حوادث کے تصور کی طرح ہمارا منطقہ حسن بھی آجکل کی حالت کو نظر میں رکھتے ہوئے کامل نہیں تسلیم کیا جا سکتا ہے اگر افہام و تفہیم سے واسطہ رکھا جائے لیکن یہ تحقیق کرنا ہے کہ نظریہ جمالیات کے متعلق یہ صورت کیونکر پیدا ہوئی۔ یہ نہایت پیچیدہ مسئلہ ہے لیکن نہایت سادہ بھی تھا۔ آج ہم حسین کا صرف ایسے بہت سے مظاہر کے لئے کرتے ہیں جن کی نوعیت مختلف ہے اور جن سے ہمارے مختلف حواس متاثر ہوتے ہیں مثلاً موسیقی۔ تصویر کشی۔ کوئی گلزار یعنی سین۔ ایک آبشار یا سمندر کا طوفان ایک نظم اور مرصع زیورات وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح ہم بہت سے احساسات کو جو آپس میں متباین ہوں جمالیات کی ذیل میں قرار دیتے ہیں جیسے سمندر کے تہیج اور تموج کی ہیبت ناک کیفیت کا تفریحی احساس یا ایک رنگ بہزاد کی کھینچی ہوئی تصویر جس کے دیکھنے سے سکون اور اطمینان ہوتا ہے یا ایک عالیشان عمارت کی پسندیدگی۔

جمالیات پر مابعد الطبیعیات کی رو سے بہت استدلال کیا گیا ہے تاکہ اس انضاد کو اتحاد کا رنگ دیا جائے لیکن کامیابی نہ ہوئی ہم بھی ایسا ہی کرنا چاہتے ہیں لیکن اس کی سبیل اور تفصیل دیگری ہے۔ بجائے اس کے کہ متعدد مختلف اور متضاد مظاہر کو زبردستی گڈمڈ کر کے فلسفہ کی رو میں بہا دیں ہم ان کا جداگانہ تجزیہ اور موازنہ کر کے ان کی ہیئتِ کذائی قائم رکھنا چاہتے ہیں۔

ایک خصوصیت تمام جمالیاتی احساسات میں مشترک ہے یعنی وہ ناگوار نہیں ہوتے۔ گوارا احساسات جو مختلف قسم کے محاسن ہم میں پیدا کرنے میں مختلف اندریانہ ذرائع سے پیدا ہوتے ہیں۔ پہلے خوشگوار اور ناگوار احساسات کی تشریح کرنی لازم ہے۔

خوشگوار احساسات وہ ہیں جو اُن اقسام یا اُن کے تصور سے پیدا ہوتے ہیں جو کسی نہ کسی طرح فرد یا جماعت کی بقا کے حق میں مفید ہوں۔ ناگوار محسوسات اس کے برعکس ہیں۔

اب دیکھئے وہ خوشگوار احساس جس کی ایک خوبصورت (یہاں یہ لفظ عام اور معروف معنی میں استعمال ہوا ہے) شئے ہماری ذات میں محرک ہوتی ہے وہ اپنی اصلیت میں ہمارے دوسرے احساسات سے مختلف نہیں ہوتے۔ وہ اس امر واقعہ کا نتیجہ ہوتے ہیں کہ آجکل جو کچھ ہمیں خوبصورت معلوم ہوتا ہے وہ دراصل فرد اور جماعت کے لئے مفید یا خطرناک تھا یا یہ ہوا ہوگا کہ انسانوں کو پہلے پہل مفید اور منفعت بخش مظاہر سے سابقہ پڑا ہوگا اور وہ امر واقعہ التزاماً ان سے وابستہ کر دیا گیا۔

جو مظاہر خوبصورت محسوس ہوتے ہیں اُن کو دو قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ وہ یا تو فردِ واحد کی ذات سے تعلق رکھتے ہیں یا نسل و جماعت سے اول قسم میں وشال، موہن اور زمناسب آتے ہیں اور دوسری قسم بالذاتہ خوبصورت یا حسین اور سندر پر منحصر ہے۔ جمالیات کی یہ شکلیں استعمال میں عموماً گڈمڈ کر دی جاتی ہیں۔ اور ان کی تاویل اور استعمال اکثر غلط ہوا کرتا ہے اور اس وجہ سے کہ ان کے مفہوم جداگانہ ہیں ان کے باہم امتیاز قائم رکھنا چاہیئے۔ ہم اگلے بیان میں ان میں سے ہر ایک سے بحث کریں گے اور اس تعلق کے ادراک کی کوشش کریں گے جو ان کو فرد و نسل کی جبلتِ تحفظ کے ساتھ ہے۔

وشال۔ وشال فردِ مدرک اور مظہر یا حادثہ طبعی کے درمیان از حد عدم تناسب اور فردِ مذکور پر اس مظہر کی قطعی فوقیت و عظمت کا احساس ہے ہر چیز جو اجوبہ بہت ہی بڑی اور عظیم الشان اور بارعب ہو وشال پن کا اثر پیدا کرتی ہے جیسے قطب کی لاٹھ، سمندر اور پہاڑ وغیرہ وشال کے احساس کی تہ میں جو احساس ہے وہ یہ ہے: "اس مظہر کے مقابلہ میں میری کیا ہستی ہے۔ اس کا احاطہ کرنا یا اس پر غلبہ پانا میرے بس کی بات نہیں" یہ احساس ہیبت سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔ اس لئے کہا گیا کہ وہ اصل ہیبت نہیں یا کہئے ہیبتناک نہیں بلکہ صرف بارعب ہے ہیبت میں آپ کو دوسری طرف سے جو نقصان کا خوف ہوتا ہے رعب میں یہ نہیں ہوتا۔ وشال کا احساس انسان کے ذہن میں اس کی بے بضاعتی اور اس کے ناچیز ہونے کا تصور تو ضرور پیدا کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ یقین بھی پیدا کرتا ہے کہ اس گرانڈیل مظہر سے جنگ کی ضرورت مفقود ہے اور یہ کہ اس کی مرعوب کرنے والی فوقیت مشاہدہ کرنے والے کو عدم آباد نہیں پہنچا دے گی۔ ہم ساحل پر کھڑے ہوئے سمندر کا سخت طوفان اور اس میں ایک ڈوبتا ہوا جہاز دیکھتے ہیں اس وقت جس قسم کا احساس ہمارے ذہن کو ہوتا ہے اسی قسم کا احساس وشال کے مشاہدے سے پیدا ہوتا ہے یعنی سخت رعب۔ لہٰذا یہ نتیجہ درست ہے کہ وشال ایک فرد کی جبلت تحفظِ ذاتی سے نہایت قریبی تعلق رکھتا ہے۔

موہن۔ موہنی وہ احساس ہے جو ان مظاہر سے پیدا ہوتا ہے جو ایک معین وقت میں حواس کے اندر بہت سے خیالات مرتسم کرتا ہے اور ادراک عقل اور رائے کے مرکزوں میں فرحت ناک ذکاوت کو بیدار کرتا ہے ایک محض اندھی دیوار یعنی وہ دیوار جس میں کھڑکی دروازہ جھروکہ کنگورا اور چھجا وغیرہ کچھ بھی نہ ہو۔ باصرہ کو دو بھر ہوتی ہے کیونکہ صرف ایک واحد ارتسام وقوع پذیر ہوتا ہے جس سے دماغ اتنا متاثر نہیں ہوتا جس قدر اُس کی وسعت دریافت کرنے کے لئے ضروری ہے۔ جب کہ دوسری دیوار جو جھروکوں کھڑکیوں اور کارنسوں وغیرہ سے مزین ہو ایک موہنے والا اثر پیدا کرتی ہے۔ کیونکہ وہ ایک نظر میں بہت سے باصرہ نواز ارتسام پیدا کرتی ہے اور دماغ کو اُس کی وسعت دریافت کرنے میں مصروف کر دیتی ہے جو شے ایک ڈھال ہو یعنی جس میں کسی طرح بھی تنوع نہ ہو وہ بسیط ہونے کی حالت میں وشالی

---

[1] واضح ہو کہ میں ان الفاظ کو اصطلاحی حیثیت دینے کی ضرورت محسوس کرتا ہوں اور سب الفاظ تو اہلِ اردو کے لئے معروف ہیں ایک لفظ وشال خوف ہے کہ بعض کو ناگوار معلوم ہو یہ لفظ سنسکرت کا ہے جو ہندی میں بہت رائج ہے میں نے بہت چاہا کہ اس کی جگہ عظیم الشان رکھ دوں لیکن وہ مرکب ہونے کی وجہ سے تصریف سے انکاری ہے لیکن وشال سے وشال پن بنا سکتے ہیں۔ اسی طرح عضوی کو چھوڑ کر اندریانہ بنایا ہے کیونکہ جو معنی اس نفسیاتی اصطلاح اندری کے ہیں عضو اس کا حامل نہیں جب دیوانہ سے دیوانہ پن بن گیا تو اندری سے اندریانہ بھی بن سکتا ہے۔

تاثر کی وجہ ہوتی ہے لیکن ہوتی میں ایسا نہیں ہوتا۔ مختصر یہ کہ جس چیز کے ادراک میں دقت ہو جس کا پھیلاؤ بہت ہو اور جس میں تفصیلات کی بہتات ہو وہ چیز ہوتی سے محروم ہوتی ہے۔

متناسب۔ متناسب یا سڈول اشیاء ایسا احساس تو پیدا نہیں کرتیں جیسا حسین شئے کرتی ہے لیکن وہ اطمینان بخش ہوتی ہیں لیکن چونکہ یہ احساس بھی خوشگوار ہوتا ہے۔ اس لئے اس کو یعنی متناسب کو اکثر حسین سے خلط ملط کر دیتے ہیں جو غلط ہے۔ متناسب جلد دلنشیں ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ مظاہر فطرت کے تدوینی قوانین کے انسانی تصور کا ہم آہنگ ہوتا ہے۔ ایک مخروطی مینار جو اپنی چوٹی پر یعنی الٹا کھڑا ہو حسن کے منافی معلوم ہو گا کیونکہ وہ غیر متناسب دکھائی دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی ساخت میل مرکزی اور اس سے صریح توازن کے تصور سے متبائن ہے۔ ہمارے خیال میں یہ آتا ہے کہ وہ اس کینڈے سے بہت مدت قائم نہیں رہے گا بعض صورتوں میں عادت بھی ایک رکن عامل کا منصب رکھتی ہے۔ پہلے لوگ کڑی ترنگوں کی چھت والے مکانوں میں رہنے کے عادی تھے جب انھوں ال کنکریٹ کی چھتیں پہلے پہل بنیں تو وہ بہت گھبرائے۔ وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ یہ چھتیں یک دم بیٹھ جائیں گی۔ اسی طرح جب انسان نے پہلے پہل گھنا درخت دیکھا ہو گا کہ وہ ایک نسبتاً کم مساحت کے تنے پر کھڑا ہے اور اوپر سے اس کا رقبہ اتنا بڑا اور پھیلا ہوا ہے تو ضرور اسے یہ گمان ہوا ہو گا کہ یہ اب گرا کہ اب گرا کیونکہ وہ اتنے تن بدن کے لئے دونوں یا ٹانگوں کا ہونا ضروری سمجھتا تھا اور کوئی جاندار ایک تنے یعنی ایک ٹانگ والا اس کے مشاہدے میں نہیں آیا تھا اور وہ اسی چیز کو مضبوط سمجھتا تھا جس کا پایہ بڑا ہو لیکن جب اس کے علم میں یہ امر دافعہ آیا کہ درخت کی شاخیں خواہ وہ کتنی دور تک پھیلی ہوئی ہوں تنے کے مقابلہ میں پتلی اور ہلکی ہیں تو عدم تناسب کا ناگوار احساس جاتا رہا۔ انسان کو جو چیز بعید الفہم متناقض اور مبہم محسوس ہوتی ہے اور وہ اپنے آپ کو اس کا مدِ مقابل نہیں سمجھتا وہ دلچسپ نہیں ہوتی بخلاف اس کے جس شئے میں خفا نہ ہو اور وہ قریب الفہم ہو ایسی شئے یگانگت اور مودت کے انداز سے اس کے لئے دلچسپ ہوتی ہے۔

اب تک کی بحث سے ہم یہاں تک پہنچے ہیں کہ وسائل ذہنی اور متناسب خارجی دنیا یعنی عدم الفہم سے اس کے مخالفانہ و معاندانہ تعلقات کے تصوراتِ اولیہ کی رو سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ کہ وہ تینوں حفاظتِ ذات کی جبلت کی ہیجانی حالت کے محرک ہیں۔ اب ہم اس سے بحث کریں گے کہ حسین اپنے محدود تعنی معنی میں اور رسند یہ دونوں ذہنِ انسانی کی تحفظِ نسلی کی جبلت سے وابستہ ہیں

حسین۔ حسن کا مشاہدہ انسان کے ذہن میں وہ ارتسام یا تاثر پیدا کرتا ہے جس سے دماغ میں ابیج یا تولید کے خاص مرکز کو انگیخت ہوتی ہے خواہ یہ براہِ راست ہو یا تلازم خیالات کے سلسلے میں۔ آدمی کی نظر میں حسن کی اول تمثیل عورت ہے۔ شاعروں کے کلام میں آپ حسن و شباب کو پہلو بہ پہلو پاتے ہیں۔ چونکہ آدمی اندریانہ طور پر عورت اور حسن کو لازم و ملزوم یقین کرنے کا عادی رہا ہے اور وہ اپنی حیوانی زندگی میں نفسانیت اور خود غرضی کا بندہ رہا ہے اس لئے وہ ہمیشہ حسین پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ وہ جنسی عنصر کو جو اس کے اندر غالب ہے اس کی شدید تحریک کرتا ہے بہ نظریہ نوعِ انسان کی دونوں جنسوں سے متعلق ہے یہ جو کچھ بھی ہے انسان کی نیچرل اور اصلی یعنی حیوانی اور شہوانی حالت سے تعلق رکھتا

ہے تہذیب اخلاق اور تمدن اجتماعیت کا نظام ان تحریکوں اور جذبات واحساسات کو حدِ اعتدال پر لے آتا ہے اور جواز و عدم جواز کے قیود عاید کرتا ہے جس میں مذہب کا بھی بڑا حصہ ہے۔

سندر ۔ سندرپن کا مظہر براہِ راست یا تلازمِ خیال کے ذریعے بچپن سے تعلق رکھتا ہے۔ بہ ظاہر بچوں سے پیار کے جذبے کی تحریک کرتے ہیں جس پر تحفظِ نسل کا انحصار ہے۔ سندر کا مفہوم ایسی ہر چیز ہے جو جسامت میں چھوٹی ہو، نفیس ہو اور ہماری امداد و حمایت کی محتاج ہو۔ اس قسم کی تصغیر اسی نسبت سے جو اسے اصل سے ہے ہم میں وہ تصور پیدا کرتی ہے جو بچے کو بالغ اشخاص سے ہے۔ یہ تصور غیر ذی روح اشیا پر بھی حاوی ہے چنانچہ بنگالی زبان میں طمنچہ کے لئے جو لفظ ہے اس کے معنی ہیں "بندوق کا بیٹا"۔

موسم بہار بہت سے مظاہرِ فطرت اپنی اہمیت اور تلازمِ خیالات کی مقدار کے بموجب ایک ہی وقت میں تحفظِ ذاتی اور تحفظِ نسل کی جبلت کو تحریک کرتے ہیں اور مختلف طور پر خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً میدانی ملکوں میں موسم بہار، بیک وقت خوبصورت موہن اور متناسب معلوم ہوتا ہے وہ مرکزِ جنسی کو ہیجان دیتا ہے۔ اس کی اتحادی نوعیت اس وجہ سے ہے کہ وہ حیوانوں یعنی جانداروں کے لئے غذا کا بڑا ذخیرہ مہیا کرتا ہے اور انہیں محنت و مشقت کے لئے قوت اور تازگی بخشتا ہے۔ موسم بہار بس موہنی بھی ہے کیونکہ وہ ایسے مظاہر بھی پیش کرتا ہے جو خوشگوار ہیں اور اس لئے محدود زمانے میں اپنی بوقلمونی کو حواس پر مرتسم کرتا ہے۔ وہ متناسب بھی ہے کیونکہ وہ انفرادی زندگی کے لئے معتدل ہے۔

نسلِ انسان کی دونوں جنسوں سے متعلق جمالیات کے جو نظریے فلسفیوں نے پیش کئے ہیں، ان میں اختلاف رائے ہے ان مختلف رایوں سے قطعِ نظر اس پر ان کے تعلقاتِ باہمی کی طرف نظر ڈالی جاتی ہے جیسے کہ وہ اس وقت کے نظامِ اجتماعی میں پائے جاتے ہیں نسلِ انسان کا جزوِ نرینہ انفرادیت اور خود غرضی کی نمائندگی کرتا ہے اس کی نظر صرف اپنے پر ہوتی ہے یا اپنے مطلب کے لئے دوسروں پر۔ ان کے لئے وہ ادھر فطرت سے برسرِ جنگ رہتا ہے اور ادھر اپنے ہم جنسوں سے منافست پر تلا ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے تحفظِ ذاتی کا خیال بحران بن کر اس کے سر پر سوار رہتا ہے بمقابلہ صنفِ نازک کے۔ بخلاف اس کے صنفِ نازک نسل کے تحفظ کے موروثی خواص کی تعمیل و تکمیل کرتی ہے وہ جنگ و منافست میں شریک نہیں ہوتی۔ اس لئے اس کو جوکھوں کم ہے۔ لہٰذا تحفظِ ذاتی کی جبلت کی ترقی کی ضرورت نہیں اور ترقی نسل و مادریت کے تصورات میں مرد سے زیادہ نشوونما پاتے ہیں۔ ان وجوہ سے اسے حسن کا احساس زیادہ ہے اور سندرپن کا احساس اس سے بھی زیادہ ہوتا ہے بچوں کی محبت اور مامتا عورت کا خاصہ ہے لیکن عہدِ حاضر کی بدعتیں جنہیں سائنٹیفک رنگ روپ دیا جا رہا ہے۔ غالباً ان خواص میں تغیرِ عظیم کا باعث ہوں گی جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

آرٹ ۔ اوّل اوّل حسن کا احساس صرف مظاہرِ فطرت سے پیدا ہوتا ہے۔ آرٹ بھی اپنے کمال اور صحت کے درجے کے مطابق ایسا احساس پیدا کرتا ہے۔ آرٹ کا کمال نیچر کی نقالی کی خوش اسلوبی ہے۔ اور یہ تشابہ اور حواس پر ارتسام اور تصورات پیدا کرنے پر موقوف ہے۔ اسی طرح زبان اور ادب بھی و مثال کا احساس پیدا کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں جب وہ کسی عظیم الشان یا فوق الانسان کا تصور قائم

کرسکیں مثال کے طور پر جب وہ قادرِ مطلق کی ذاتِ پاک کا بیان کریں یا عظیم مشاہدۂ فطرت یا جنگ یا شدید انسانی سوانح کا ذکر کریں۔

فنِ تعمیر و تمثال کا احساس اُس وقت پیدا کرتا ہے جب وہ ایسی وسیع اور رفیع الشان عمارتیں کھڑی کرے جن کے مقابلہ میں انسان اپنے تئیں بہت چھوٹا اور ضعیف و حقیر محسوس کرے جیسے کہ وہ اُس وقت محسوس کرتا ہے جب وہ قطب کی لاٹھ کے پاس کھڑا ہوتا ہے۔ یا ہمالیہ کے کسی گھنے جنگل میں ہوتا ہے۔

آرٹ کے کارنامے تناسب کا تصور اُس وقت پیدا کرتے ہیں جب کہ اُس کا اصل موضوع یا معرض اس کی شکل سے نمایاں ہو۔

کیفی

ایک عظیم الشان ساعت

اچھی قسمت جو میرے قدموں کی رہنما بنی اور لے گئی مجھے باہر آبادی سے دور۔ وہاں جہاں جنگل کے پھول کھلتے ہیں ــــــ ایک قوسِ قزح اور ایک کوئل، بارِ خدایا!

کس قدر بیش بہا اور عظیم الشان ہے یہ ساعت

جان لو اے بھیڑو

اور گایو

جو تکتی ہو کہ میں یوں پہروں سے کھڑا ہوں۔

موسلا دھار بارش میں بھیگی ہوئی گھاس پر۔

ایک قوس قزح اور کوئل کا ایک گیت

کیا جانے اکٹھے نہ آئیں گے پھر

کیا جانے نہ آئیں گے پھر

قبر کے اُس پار

"گ"

خونی بینڈ

روح بے چین ہی خاموش ہوائے فوج کے بینڈ   اس طرح صبح کی مخمور ہواؤں میں نہ اینڈ
تجھ میں آواز ہے فولاد شکن تیروں کی   سنسناہٹ ہے چمکتی ہوئی شمشیروں کی
کتنی ماؤں کے کلیجوں کی ہیں قاشیں تجھ میں   کتنے مہ پارہ جوانوں کی ہیں لاشیں تجھ میں
کتنی روندی ہوئی لاشوں کی ہے سُرخی تجھ میں   کتنی بیواؤں کے چہرے کی ہے زردی تجھ میں
کتنی خوابیدہ ہیں مایوس نگاہیں تجھ میں   کتنے معصوم یتیموں کی ہیں آہیں تجھ میں
تیرا ہر راگ ہے ڈوبا ہوا چشمِ نم میں   رقصِ خونی کی دھمک ہے ترے زیر و بم میں
سِسکیاں تجھ میں ہیں غلطیدہ دل افگاروں کی   کروٹیں موت کی ہیں گت میں ترے تاروں کی
تیری ہر تان میں پوشیدہ ہیں لاکھوں آنسو   تیری آواز میں غلطاں ہے جوانی کا لہو
گم ہیں رستے ہوئے زخموں کی بہاریں تجھ میں   خنجروں کی ہیں چمکتی ہوئی دھاریں تجھ میں
نغمہ ہے لَے میں تری خون کے فواروں کا   زمزمہ تجھ میں ہے چلتی ہوئی تلواروں کا

تیری آواز جب احساس پہ چھا جاتی ہے
موت کے دل کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے

جوش

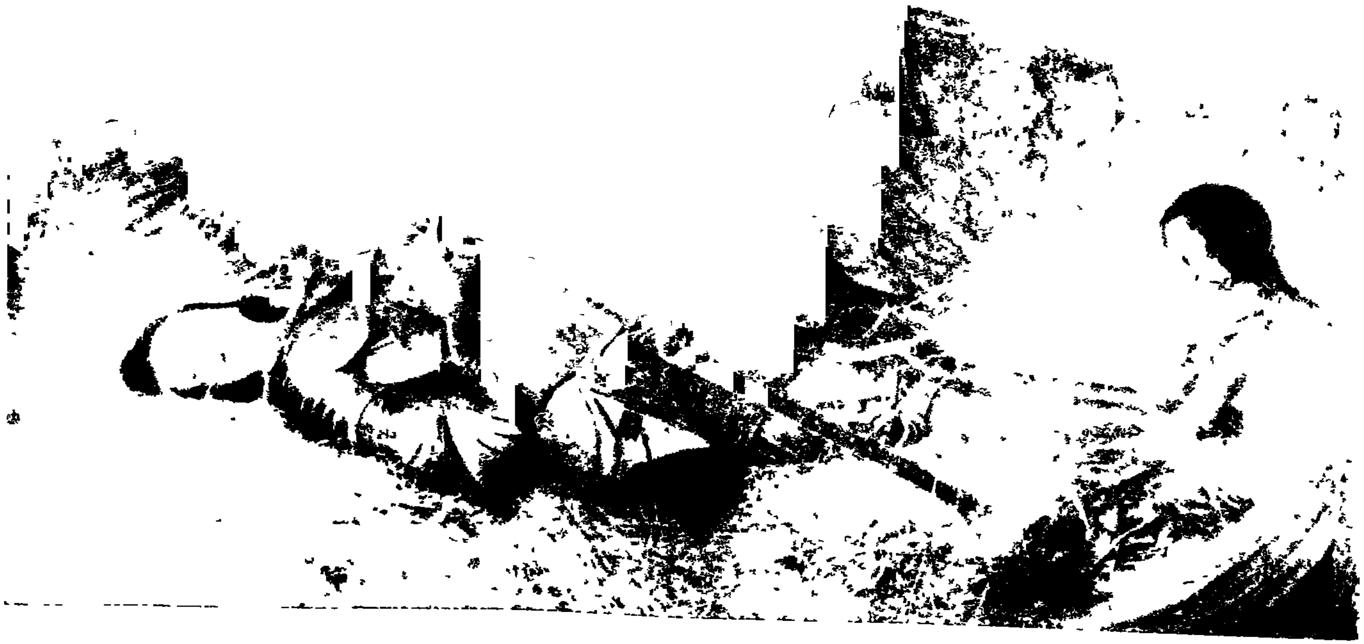
مسرور بچہ

آج میں نے دیکھے رنگ برنگ کے پھول کہ شاخیں اُن سے پٹی پڑی تھیں
لیکن ان میں ایک بھی ایسا نہ تھا جیسا وہ پھول جسے بچے نے توڑ لیا۔
میں نے شکاری کتوں کا غل باغوں میں سنا۔
لیکن ان میں ایک بھی ایسا نہ تھا جیسا وہ کتا جسے بچے نے بھونکتے سنا۔
میں نے سینکڑوں چڑیوں کے چہچہے آج سُنے
لیکن اُن میں ایک بھی ایسی نہ تھی جیسی وہ جسے بچے نے چہچہاتے سُنا
دیکھنے کو میں نے ہزاروں تتریاں دیکھیں
لیکن اُن میں ایک بھی ایسی نہ تھی جیسی وہ جسے بچے نے اڑتے دیکھ پایا
میں نے بیسیوں گھوڑے دیکھے گھاس پر لیٹتے ہوئے۔
لیکن اُن میں ایک بھی ایسا نہ تھا جیسا وہ جسے بچے نے گزرتے دیکھا
میری دنیا آج کے دن بہت پرلطف رہی
لیکن اس میں وہ دلکشی کہاں جو بچے کی دنیا میں تھی۔

گلچیں۔







ژان دارک میدان جنگ میں سوتی ہے

ننھی چڑیا

چمن میں دمِ صبح آ پیاری چڑیا، — کوئی سرمدی گیت گا پیاری چڑیا
تو رقاصۂ بزمِ قدرت ہے ننھی — ہمیں رقص اپنا دکھا پیاری چڑیا
گلوں کو بہت ناز ہے نازکی پر — غرور ان کا آ کر مٹا پیاری چڑیا
ادھر جھول تو شاخِ گل سے لپٹ کر — ادھر گل کو جھولا جھلا پیاری چڑیا
نہیں ہے خیاباں میں رونق ترے بن — خیاباں میں ہو جلوہ زا پیاری چڑیا
بیاباں کو چپ سی لگی ہے ترے بن — بیاباں میں آ چہچہا پیاری چڑیا
بہشتِ بریں کی کوئی حور ہے تو — پری ہے پرستاں کی یا پیاری چڑیا
تو حد ہے نفاست کی معصومیت کی — نزاکت کی جاں خوش ادا پیاری چڑیا
کوئی شعبدہ ہے کسی سحر فن کا — تو اے دلربا خوشنما پیاری چڑیا
جو رنگیں نوا ہے تو رنگیں ادا بھی، — ادا کار ہے عشوہ زا پیاری چڑیا
تو پھولوں کی سرتاج پھولوں کی رانی — تو پھولوں کی جاں خوشنما پیاری چڑیا
تو اعجاز کا اک عقیقی مرقع، — تو خوبی کی اک انتہا پیاری چڑیا
گھنی سبز شاخوں کے پتوں میں چھپ کر — لہک چہچہا، پھڑپھڑا پیاری چڑیا
شبستاں ہے تیرا گلاب و سمن میں — ہے گہوارہ ہر گل ترا پیاری چڑیا
ترے سامنے شرم سے جھک چلے ہیں — گل و یاسمن موتیا پیاری چڑیا
بہت ناز سے تتلیاں اڑ رہی ہیں — ذرا اپنے پر پھڑپھڑا پیاری چڑیا

کوئی چھپاتا ہوا پھول ہے تو — جو صبحِ ازل کو کھلا پیاری چڑیا
کسی غنچہ مری چمن میں پلا ہے — ترا حسن معجز نما پیاری چڑیا
کوئی نجمِ ثاقب ہے تو آسماں کا — جو گلشن میں آ کر گرا پیاری چڑیا
کسی حسنِ پنہاں کا عکسِ مصفا — ہوا تجھ میں جلوہ نما پیاری چڑیا

مرے قلب کو اپنے نغموں سے گرما — مری ننھی آتش نوا پیاری چڑیا
تو اڑتی ہوئی چہچہا اٹھ یکایک — لطافت کی کر انتہا پیاری چڑیا
اس آواز کو دل کے اُس پار کر دے — مری روح کو جگمگا پیاری چڑیا
ترے گیت روحِ حزیں کو جگا دیں — مسلسل یہی گیت گا پیاری چڑیا

ترے بال و پر وسعتوں سے شناسا — ہے رفعت میں آنگن ترا پیاری چڑیا
فضائیں تری حسن آگیں فضائیں — منور جہاں ہے ترا پیاری چڑیا
تری عادتیں خوب، اعمال بہتر — کہ فطرت ہے مذہب ترا پیاری چڑیا
کسی سے عداوت نہ پرخاش تجھ کو — جبھی خوش ہی صبح و مسا پیاری چڑیا

مرے دل کو بھی اپنی پاکیزگی سے — کوئی حصہ کر دے عطا پیاری چڑیا
یہ عاداتِ خوش اپنی دے ڈال مجھ کو — غمِ دہر دل سے بھلا پیاری چڑیا
محبت کی گرمی ہے نغموں میں تیرے — یہ گرمی مجھے کر عطا پیاری چڑیا

سنا مجھ کو رفعت کی کچھ داستانیں
بلندی کی تانیں اُڑا پیاری چڑیا

ح۔ب

سنگ تراش

جب اُس نے شہر کے اندر قدم رکھا تو کوئی شخص اس کو دیکھنے کے لئے موجود نہ تھا۔ نور کے تڑکے دربان نے ابھی شہر کا بڑا دروازہ کھولا ہی تھا کہ وہ داخل ہوا۔ کوچہ و بازار پر رات کی ظلمت ابھی پھیلی ہوئی تھی لیکن آسمان کا میلا اب بکھرنے لگا تھا۔ مشرق نے رات کی سیاہی پر مرمر کی ایک دھندلی سی لکیر کھینچ دی تھی۔ صبح کے رنگ ابھی افق پر روشن نہیں ہوئے تھے مگر بڑھتا ہوا اُجالا سفید ریشم کے تاروں کی طرح اپنے ہی نور سے جھلمل جھلمل کر رہا تھا۔

کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ شروع شروع میں کسی نے اس سے وطن، کسی نے مذہب و قومیت کے متعلق قیاس دوڑانے کی کوشش کی۔ آخر جب کچھ پتا نہ چلا تو جیسے انسانوں کی عادت ہے تھک کر خود ہی خاموش ہو گئے۔

لیکن جس چیز نے یہ سب باتیں انکو بالکل بھلا دیں وہ اس کا کام تھا۔ اس شہر میں یہ صنعت بالکل اچنبھے کی چیز تھی۔ وہ پتھر کے بے حس ٹکڑے لیتا اور اپنے تیشے کی ضربوں سے ان میں جان ڈال دیتا۔ مسکراتی ہوئی، روتی ہوئی، بولتی ہوئی، سوچتی ہوئی مورتیں سنگ مرمر کا لباس پہنے گھر گھر پھیل گئیں اور صناع کے اعجاز کی گواہی دینے لگیں۔ لوگ خود بھی حیران رہ گئے جب انہوں نے یہ دیکھا کہ ان پتھر کی مورتوں کے آنے کے بعد اُن کے غموں میں تلخی کی وہ پہلی کیفیت نہیں رہی اور مسرتوں میں پاکیزگی کی ایک نئی جھلک نمودار ہو گئی ہے۔ بوڑھے جو امید سے کنارہ کش ہو کر دنیا پر آخری نگاہِ حسرت ڈال رہے تھے زندگی کی ان جیتی جاگتی اور ہنستی ہوئی تصویروں کو دیکھ کر دل میں مسرت کی ایک لہر محسوس کئے بغیر نہ رہتے۔ بچے جن کے لئے ہر لحظہ ایک نئی خوشی کی تلاش زندگی کا سب سے اہم کام تھا، اچھلتے کودتے سنگ تراش کے گھر آتے اور اس کے بنائے ہوئے فرشتوں کے حسن اور معصومیت سے ایک ایسی کیفیت لے جاتے جو انہیں صرف اپنے سنہرے خوابوں میں میسر ہوتی تھی۔ غمزدہ مائیں جن کی گود قضا نے خالی کر دی تھی روتی ہوئی آتیں اور اُس آسمانی سرود میں پناہ لیتیں جس کے سہارے پر سنگ تراش اندوہ و یاس کو تسلیم و رضا سے گذارتا ہوا طمانیت کی منزل تک پہنچا دیتا تھا۔ بعض نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اس نے ان کے غم کو محض ایک بے معنی چیز نہیں رہنے دیا بلکہ اپنے ہنر کی تراش و خراش میں سے ایک نئے مفہوم سے آشنا کر دیا ہے۔ جب وہ کوئی نئی مورت بناتا تو لوگ بے اختیار ہو کر کہتے کہ اب اس کے ہاتھ بھی اس سے بہتر تصویر یقیناً کبھی نہ بنا سکیں گے مگر وہ اپنا سر ہلاتا اور مسکرا کر کہتا: "یہ تو ابھی ابتدا ہے۔ جو کام مجھے کرنا ہے اس کا وقت ابھی نہیں آیا۔"

وہ شہر کے شور و شغب سے ہٹ کر ایک پرسکون محلے میں تنہا رہتا تھا۔ اس کے مکان کے دریچے مشرق کی طرف کھلتے تھے اور بارہا صبح صادق

کے اُجلے آسمان پر جب بلند عمارتوں کے گنبد اور مینار اور مندروں کے کلس ابھی فضا کی تیرگی میں سے اُبھر ہی رہے ہوتے، وہ اپنے کام میں مصروف نظر آتا تھا۔ شہر کے رئیس بارہا اس کو اپنی محفلوں میں بلا بلا بھیجتے اور وہ کبھی ان کے اصرار سے مجبور ہو کر چلا بھی جاتا لیکن وہاں جا کر ایک مسلسل خاموشی اور بے کلی کے عالم میں بیٹھا رہتا۔ ان مجلسوں میں عام طور پر جو چرچے رہتے تھے ان سے وہ بالکل ناواقف تھا۔ وہاں جاتے ہی اس کو اس طرح چپ لگ جاتی جیسے کوئی شخص اپنا کچھ کھو کر حیران بیٹھا ہے۔ ان محفلوں میں ایسے عالم بھی موجود ہوتے تھے جو گفتگو کے ہر پہلو میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ یہ اپنی کتب بینی پر بے حد نازاں تھے اور جو کتابیں پڑھتے تھے ان کی گنتی رکھتے تھے۔ چنانچہ لوگ ان کی باتوں کو بڑے ادب سے سنتے تھے۔ سنگ تراش کی خاموشی کو دیکھ کر یہ عالم حقارت سے مسکراتے اور سرگوشیوں میں کہتے "آج اس شخص کا بھرم کھل گیا۔ یہ بیچارا علم و فن میں سے کسی چیز کو بھی نہیں سمجھ سکتا۔"

سنگ تراش جس کمرے میں کام کرتا تھا اس کے دریچے کے سامنے ایک مولسری کا درخت تھا۔ جب اس میں شگوفے آ جاتے تو اس کی لدی ہوئی شاخیں جھک جھک کر زمین کو چھونے لگتیں۔ چڑیاں، طوطے، قمریاں اکثر اس کے پتوں میں بسیرا لیتیں اور کبھی کبھی کوئی فاختہ یا مینا بھی آ بیٹھتی۔ جب لوگ اس کی تنہائی کا ذکر کرتے تو وہ بارہا اسی دریچے میں سے باہر کو جھانک کر کہتا کہ اس سے زیادہ رونق کہاں ہوگی۔ وہ ہر صبح اپنے دریچے میں ان چڑیوں اور طوطوں کے لیے کچھ کنگنی اور باجرا ڈال دیتا اور یہ اس سے اتنے مانوس ہو گئے کہ بعض دفعہ جب وہ بے حس و حرکت اپنے کام میں لگا ہوتا تو کوئی بیباک چڑیا چوں چوں کرتی ہوئی پھدک کر اس کے کندھے پر آ بیٹھتی۔ یہ پرندے فی الحقیقت اس کی زندگی کا ایک ضروری جزو بن گئے تھے۔ تنہائی کے عالم میں کبھی کبھی جب اس کا حسن آفرین تخیل کسی غروب ہوتے ہوئے ستارے کی طرح مدھم اور بے نور ہو جاتا تو اسے اپنے گوشۂ خلوت سے وحشت ہونے لگتی۔ اس کے دل پر ایک خوف طاری ہو جاتا اور اسے یوں معلوم ہوتا گویا اُسے ایک بوجھ سا گھسیٹتا ہوا اس کی روح کی عظیم الشان تاریک گہرائی میں لئے جا رہا ہے۔ اُس وقت ان پرندوں کا چہچہا اسے پھر کھینچ کر روشنی اور مسرت کی دنیا میں لے آتا۔ اُس وقت وہ دریچے میں سے باہر کو جھک پڑتا۔ اس کی آنکھیں اور کان ان پرندوں کے لئے وقف ہو جاتے۔ وہ ان پرندوں میں ایک پرندہ ہو جاتا۔

پرندوں کی رفاقت کے علاوہ ایک اور پاکیزہ مسرت اُسے حاصل تھی۔ ہمسائے کے مکانوں کے بچے اس کے بے تکلف دوست بن گئے تھے۔ جس دن مدرسے میں چھٹی ہوتی وہ پرا باندھ کر اس کے پاس آتے اور ایک پہر ضرور اس کے گھر میں گذارتے۔ وہ ان کو ساتھ کبھی آنکھ مچولی کھیلتا، کبھی ان کو کاندھوں پر اٹھا کر اِدھر اُدھر بھاگتا۔ ان میں سے بعض کبھی اس کے اوزار اٹھا لیتے اور پتھر کے بیکار ٹکڑوں کو لے کر تراشنے بیٹھ جاتے۔ جو ذرا چھوٹے ہوتے وہ اس سے پوچھتے کہ اس کی بنائی ہوئی مورتیں چل پھر بھی سکتی ہیں یا نہیں اور کیا کبھی کوئی بات بھی کرتی ہیں؟ بعض کو اس بات پر حیرت ہوتی کہ آخر اس کو یہ کیونکر معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں پتھر کو چھیلنے پر اندر سے اس طرح کی مورت نکل آئے گی۔ غرضکہ جب وہ باتیں کرنے پر آتے تو ان کے سوالوں کا جواب دیتے دیتے سنگ تراش اپنے کام کو بھی بھلا دیتا۔ پھر بچے

ہی اکتا جاتے اور سب ایک ایک پھریری لے کر اٹھتے اور میدان میں دوڑیں لگانے کے لئے نکل جاتے۔

ایک دن صبح ہی صبح جب بچے سنگ تراش کے مکان پر پہنچے تو انہوں نے ایک عجیب نظارہ دیکھا۔ وہ سنگ مرمر کی ایک عظیم الہیئت تراشی سل کے سامنے بےحس و حرکت کھڑا تھا۔ اس کا جھریرا بدن کسی قدر آگے کو جھکا ہوا تھا۔ اس کی بھویں تن رہی تھیں اور ماتھے پر بل پڑے ہوئے تھے اور اس کی چمکتی ہوئی آنکھیں سنگ مرمر پر اس طرح گڑی تھیں جیسے سل کے اندر دھنس جانا چاہتی ہیں۔ بچے اس لئے دبے پاؤں آگے بڑھے کہ اچانک اسے چونکا دیں لیکن جوں ہی ان کی نظر اس کے چہرے پر پڑی وہ خود چونک اٹھے اور ایک دھیمی اور لمبی "اوہ!" کے ساتھ اس طرح پیچھے ہٹے جس طرح مرغابیوں کی قطاریں کسی خطرے کا سراغ پا کر اپنے خط پرواز سے منحرف ہو جاتی ہیں۔ سنگ تراش ان کی آوازوں کو سن کر مسکراتا ہوا مڑا۔ وہ آج ان کے ساتھ نہیں کھیل سکتا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ خود میدان میں جا کر کھیل آئیں کیونکہ آج وہ ایک اتنے بڑے کام کو شروع کر رہا تھا کہ اب تک کے سب پہلے کارنامے اس کو اس عظیم الشان کام کا دھندلا سا خاکا معلوم ہوتے تھے۔ جو بچے عمر میں کچھ بڑے تھے انہوں نے بیتاب ہو کر پوچھا۔ وہ کیا کام ہے؟ وہ کس چیز کی مورت ہوگی؟

سنگ تراش تھوڑی دیر کے لئے رکا جیسے اس سوال کا جواب دینے کے لئے اسے صحیح الفاظ نہیں ملتے۔ آخر اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "بس تم یہ سمجھ لو کہ یہ مورت ایک بہت خوبصورت عورت کی ہوگی"۔

"جیسے حوروں کی شکل ہوتی ہے؟"

"بہشت کی حوروں اور آسمان کی دیویوں سے بھی زیادہ خوبصورت"

ہم اس کو دیکھنے آئیں گے"۔

"ہاں ضرور!"

اور جب بچے چلے گئے تو وہ پھر سنگ مرمر کے ستون کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ ستون کے پائے کے پاس اس کے اوزاروں کا ڈھیر لگا تھا۔ اب اس نے ایک بسولی اٹھائی لیکن اسے ہاتھ میں لے کر پھر بہت دیر تک اسی طرح دم بخود کھڑا رہا۔ ایک شکل جو سالہا سال سے اس کے تخیل کی دنیا میں گھوم رہی تھی۔ جس کی گریزپا درخشانی ہمیشہ اس کو فریب دے کر نکل جاتی تھی آج اپنی پوری تجلیوں کے ساتھ اس کے دماغ کو منور کر رہی تھی۔ آج وہ اپنے کام کی عظمت سے خود مرعوب معلوم ہوتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک فاتح کی سی چمک ضرور تھی لیکن اس کے چہرے کے نازک نسوانی خدوخال پر ایک ہیجانی لرزش کے آثار موجود تھے اور اس کا اپنی انگلیوں کو اضطراری طور پر جھٹکنا اس کے اندرونی اضطراب کا پتا دے رہا تھا۔ اس کی بسولی ایک تھپکی سی ملاطفت کے ساتھ سنگ مرمر کو جگہ جگہ ٹھکراتی تھی وہ پتھر کی اس سل کو بھی جس سے نور کی اس شکل کا ظہور ہونے والا تھا احترام کے احساس کے بغیر نہ دیکھ سکتا تھا

اور اب سوچ رہا تھا کہ سنگِ مرمر کو بسولی کی پہلی ضرب کس طرف سے لگائی جائے۔

دن ڈھل چکا تھا جب آخر اس نے اپنا کام شروع کیا۔ لیکن جب پتھر پر تیشے کا پہلا وار ہو چکا تو پھر صبح سے شام تک اس کا وقت اپنے محل میں گزرنے لگا۔ اب سنگ مرمر کو چھوڑ کر اُسے برمے اور بسولے۔ تیشے اور ریتی کے سوا کوئی چیز نظر نہ آتی تھی۔

اس نے عام دستور کے خلاف اپنے مجسمے کو پیروں کی طرف سے شروع کیا۔ ایک نازک برہنہ پاؤں سنگ مرمر کی ایک چوکی پر جما ہوا تھا اور دوسرا اس پر سے اٹھ رہا تھا جیسے مجسمہ نیچے اترنے ہی کو ہے۔ ان پیروں کی پہلی ہی تراش میں اس نے ایسی جان ڈال دی تھی کہ مرمر کی رگوں میں ایک تھرتھری سی نظر آتی تھی اور زندگی کی شعاعیں پتھر میں سے چھن چھن کر نکلتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ لیکن ان کی تمام رعنائی کو آشکار کرنے سے پہلے وہ پورے مجسمے کو ایک ابتدائی صورت دے لینا چاہتا تھا۔ چند روز کی لگاتار محنت کے بعد وہ پاؤں سے بڑھتا ہوا سر تک جا پہنچا تھا۔ اب بڑے اوزاروں کو چھوڑ کر اس نے صرف نازک اوزار اپنے استعمال کے لئے رکھے۔ مجسمے کے اعضا کا باہمی تناسب قائم ہو چکا تھا۔ اب ان کا اپنا اپنا حسن تکمیل کا منتظر تھا۔

اس منزل پر اُسے نہ صرف اپنا پورا کمالِ فن بلکہ اپنا پورا صبر بھی کام میں لانا پڑا۔ مجسمے کے ان اجزا کی ایک ایک تفصیل کے انکشاف میں اسے بعض دفعہ کئی کئی دن لگ جاتے۔ بار بار اسے یہ احساس ہوتا کہ پتھر نے اس کے اپنے تصور کی لطافت کا پورا حق ادا نہیں کیا۔ ایسے موقعوں پر اس کی ننھی سی چھینی ایک نہایت محدود سے رقبے کو بہم کاوش کے ساتھ دیر تک چھیلتی اور کریدتی رہتی۔ لیکن تخلیق کا یہ عمل کبھی کبھی غیر متوقع اور برجستہ کامیابیاں بھی اپنے ساتھ لاتا۔ مجسمے کے خدوخال میں کسی پنہاں جذبے کی لطیف سی جھلک اس طرح ابھر آتی کہ وہ خود عش عش کر اٹھتا۔ کسی ایک ہی تراش سے کوئی اشارہ اس طرح بولنے لگتا کہ اس پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ اُس وقت اس کی شادمانی اس کے اندر سما نہ سکتی۔ وہ اٹھتا اور اپنی مسرت کی بےتابی سے کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگتا اور پھر جب تک یہ ہیجان فرو نہ ہو جاتا کام کو ہاتھ لگانا اس کے لئے محال ہوتا۔

اب گویا اس کی زندگی نے سنگِ مرمر کے اس مجسمے سے پیمانِ وفا باندھ لیا۔ اس کے بیداری کے خیال اور اس کی نیند کے خواب سب مرمر کی تصویروں سے آباد رہتے تھے۔ سڑک پر سے راہگیر کبھی باتیں کرتے، کبھی گاتے ہوئے گزرتے تھے۔ خوانچے والے حلوے بادام کشمش کی پکار لگاتے ہوئے ایک دم کے لئے اس کے دروازے پر بھی رکتے۔ قمریاں اور طوطیاں اب بھی اس کے دریچے کے پاس شور مچاتیں مگر اب اس کے کان ان آوازوں کو نہ سنتے تھے۔ بچے اب بھی آتے تھے اور وہ تھوڑی دیر ان کے ساتھ ضرور کھیلتا لیکن پھر وہ ان کو دو ایک لطیفے دو ایک کہانیاں سناتا اور وہ ہنستے اور کھلکھلاتے ہوئے چلے جاتے۔ چھ سات سال کا ایک خاموش بچہ جس کی پیشانی روشن اور آنکھیں متین تھیں کبھی کبھی ان کے جانے کے بعد بھی وہیں بیٹھا رہتا اور جب سنگ تراش اُسے بتاتا کہ اب وہ اپنے کام میں لگنا چاہتا ہے تو وہ جواب دیتا "میں چپ بیٹھا رہوں گا۔ کوئی بات

نہیں کروں گا۔" اور پھر سنگ تراش اپنے کام میں لگ جاتا تو وہ روشن پیشانی والا بچہ اپنی معصوم آنکھوں سے سنگتراش کی انگلیوں کا تعاقب اس طرح کرتا گویا سنگ مرمر کے ہر نازک خم اور دل فریب ابھار کو پیدا ہوتے ہوئے دیکھنا اس کی زندگی کا سب سے عجیب مشغلہ ہے۔ اس کی خاموشی اس قدر گہری ہوتی کہ سنگ تراش اس کی موجودگی سے غافل ہو کر اپنے کام میں کھو جاتا۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد جب وہ پھر بیدار ہوتا تو بچے کے معصومانہ سکوت کو دیکھ کر ایک دم اپنے اوزار پھینک دیتا اور اٹھ کھڑا ہوتا۔ پھر وہ اسی جگہ فرش پر خود گھوڑا بنتا اور بچے کو اپنی پیٹھ پر سوار کر کے کمرے کے چاروں کونوں میں لئے پھرتا

لیکن اپنے کام کی تکمیل کے لئے اسے جس امن و سکون کی آرزو تھی اس کا قائم رکھنا اس کے لئے روز بروز مشکل ہونے لگا شہر میں دھوم تھی کہ سنگ تراش نے حسنِ کامل کی تعبیر کے لئے ایک عجیب و غریب مجسمہ تیار کرنا شروع کیا ہے۔ لوگ مضطرب تھے کہ اس مجسمے کو ایک نظر دیکھ سکیں۔ شہر کے بڑے قاضی نے بھی یہ پرچے سنے۔ ایک دن اس نے اپنے سر کے خاکستری بالوں پر سبز ریشم کا عمامہ رکھا اپنے بھاری تن و توش پر حریر کی قبا ڈالی اور اپنے چند مصاحبوں کو لے کر سنگ تراش کے محل میں پہنچا۔ اس کے ایک ہاتھ میں رنگین جریب اور دوسرے میں عقیق کے دانوں کی تسبیح تھی جو سونے کے تاروں میں پروئی گئی تھی۔ قاضی نے محل میں داخل ہوتے ہی کہا۔ "اف اس پتھر کی مورت کی خاطر اتنا شور تھا! کیسا کفرانِ نعمت ہے! ایسا پتھر خلق خدا کے کسی کام آ سکتا تھا۔ بھلا یہ مورت بنا کر تمہیں کیا فائدہ ہوگا؟"

دریچے سے باہر مولسری کے درخت پر ایک فاختہ دھیمے سُروں میں کو کو کر رہی تھی۔ سنگ تراش نے ایک نگاہ قاضی کی پوشاک کے طلا و حریر پر ڈالی اور پھر فاختہ کی طرف اشارہ کر کے جواب دیا۔ "وہی فائدہ جو اس پرندے کو گانے سے ہو رہا ہے"۔

"کیسی مہمل بات ہے! ان خیالی تصویروں کے بجائے کسی نیک عمل پر توجہ دینا ہزار گنا بہتر ہے"۔

"یہ خیالی تصویر نہیں ہے۔ میں نے اسے نہیں بنایا۔ یہ مورت ہمیشہ سے موجود تھی اور صرف اپنے ظہور کی منتظر تھی۔ یہ مجھے پتھر کی ہر سل میں سے پکار پکار کر بلاتی تھی۔ اس کی پکار مجھے ہر پہاڑ پر بکھری ہوئی نظر آتی تھی لیکن ابھی مجھے یہ قدرت نہ ملی تھی کہ اسے رہائی دوں۔ اب میں نے صرف ایک ایسی کشمکش میں اس کی مدد کی ہے جو یہ خود ازل سے کر رہی تھی۔

"آہ! بدنصیب، کاش تو یہ وقت حقیقت کی تلاش میں صرف کرتا!"

"حقیقت! حقیقت کسے کہتے ہیں؟ حقیقت اور حسن میں کیا فرق ہے؟ اپنے نزدیک میں بھی حقیقت کے چہرے پر پردے ہٹا رہا ہوں"۔

"تو پھر تم کس نتیجے پر پہنچے ہو؟"

یہ سوال قاضی نے نہایت تلخی کے عالم میں پوچھا۔ اس کے چہرے پر غصے کی شکنیں پڑی ہوئی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سنگ تراش کو اپنی نگاہ و عتاب سے جھلس ڈالے گا۔ مگر سنگ تراش نے اسی اطمینان سے جواب دیا۔ "آخری منزل تک رسائی انسان کو نہیں دی گئی۔

کہ خدا کی تقدیس کا حق انسان سے ادا ہو سکتا ہے ؟ پھر بھی انسان ایک ایسی چیز کو شمار کرنے سے باز نہیں رہتا جس کا شمار ناممکن ہے"
اور یہ کہہ کر سنگ تراش نے ایک نگاہ قاضی کی تسبیح پر ڈالی۔

اب قاضی کے غیظ و غضب کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس نے اپنی مرصع جریب کو ہوا میں بلند کیا اور کہا "مجہول!" لیکن پھر کسی اور خیال سے اس نے جریب دفعتہً نیچی کر کے سنگ تراش کو جہنم کی ایک خوفناک دھمکی دی اور بڑبڑاتا ہوا اپنے مصاحبوں سمیت باہر نکل گیا۔

فنِ سنگ تراشی کے کچھ نقاد بباطن اپنے تجسس سے مجبور ہو کر مگر بظاہر سنگ تراش کو ممنون کرنے کے لئے اس کے مکان پر آئے۔ وہ تھوڑی دیر تک مجسمے کے سامنے کھڑے ہو کر ایک واقف کارانہ انداز سے آنکھیں پھیرتے اور سر ہلاتے رہے۔ اس دن سنگ تراش اپنے مجسمے کے چہرے پر سعادت و پاکیزگی کی وہ جھلک پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو صرف بے لوث روحوں کے حصے میں آئی ہے۔ ایک نقاد نے کہا "یہ کوشش خلاف قاعدہ ہے کیونکہ فنون کو اخلاق سے کوئی تعلق نہیں" دوسرے نے کہا "خیر یہ تو ایک اصولی بحث ہے جس سے قطع نظر کرنا چاہیئے لیکن بڑا عیب اس میں یہ ہے کہ مجسمے کا اٹھتا ہوا قدم ہماری حسِ واقعیت کو صدمہ پہنچاتا ہے۔ یہ جنبش نہیں ایک ایسی امید دلاتی ہے جو کبھی بر نہیں آسکتی"۔ ایک اور نے کہا "یہی تو اس کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ البتہ داہنے ہاتھ کی انگلیاں اگر ذرا آگے کو پھیلا دی جاتیں تو نہ صرف روانی کی ایک کیفیت پیدا ہو جاتی بلکہ بائیں پاؤں اور داہنی پنڈلی کے ساتھ ان کا خاص تناسب قائم ہو جاتا"۔ سنگ تراش نے یہ سب باتیں خاموشی کے ساتھ سنیں مگر اتنے میں دو ایک نقادوں نے تیشے اور برمے ہاتھ میں پکڑ لئے اور مجسمے کا رخ کیا۔ سنگ تراش نے آگے بڑھ کر بغیر درشتی کے مگر مضبوطی کے ساتھ یہ چیزیں ان کے ہاتھ سے لے لیں اور کہا۔ "جو تصور میں پیش کرنا چاہتا تھا وہ ایسا ہی ہے۔ اس میں کسی تبدیلی کی گنجائش نہیں"۔ یہ کہہ کر وہ مسکراتا رہا مگر نقاد اس کی خود پسندی اور نافہمی پر مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے چلے گئے۔

اس کے چند روز بعد ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ سنگ تراش مجسمے کے بیشتر حصے کی تکمیل کر چکا تھا اور اب صرف چہرے کے نقوش صاف کر رہا تھا۔ جو لوگ تقریباً ہر روز اس کے محل میں جھانک لگا جاتے تھے انہوں نے ایک دن ناگہاں محسوس کیا کہ مجسمے کے چہرے کو خود سنگ تراش کے خال و خد سے خاص مشابہت ہے اور یہ مشابہت روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ شہر کے لوگوں میں اس کے متعلق پہلے ایک بھنبھناہٹ سی ہوئی اور پھر ایک غلغلہ برپا ہو گیا۔ طرح طرح کے قیاس دوڑائے گئے۔ آخر سب اس پر متفق ہوئے کہ وہ اپنی بہن کی مورت بنا رہا ہے۔ لوگوں کی جدت طرازی یہیں ختم نہ ہوئی۔ ان کے زورِ تخیل نے اس کی بہن کی حسرتناک موت۔ سنگ تراش کے رنج و غم اور پھر اس صدمے کی تاب نہ لا کر وطن سے نکل کھڑے ہونے کو ایک دل گداز داستان کی شکل دے دی۔ ادھر خود سنگ تراش کو اپنی اور مورت کی اس مشابہت کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔ جب بعض لوگوں نے اس کو اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی تو وہ پہلے تو چونکا مگر پھر مورت کے چہرے پر نگاہ ڈال کر ہنس پڑا اور کہنے لگا۔ لیکن حیران ہونے کا موقع ہی کیا ہے ؟ اگر اس کو مجھ سے کوئی ربطِ نہانی نہ ہوتا تو صبح آفرینش ہی میرے انتظار میں کیوں رہتی ؟"

شہر والوں کے اشتیاق میں ہر روز اضافہ ہوتا گیا اور اب بعض دفعہ ایک ہجوم سنگ تراش کے مکان کے سامنے جمع ہو جاتا۔ ایک شہزادہ جسے

فنونِ لطیفہ کا مربی بننے کا بے حد شوق تھا ان ہنگاموں سے اس قدر متاثر ہوا کہ مجسمے کی تکمیل پر اس نے صنّاع کو زر و جواہر کے ساتھ تولنے کا وعدہ کیا۔ اس عظیم الشان قدردانی کی وجہ سے شہر میں ایک طوفان مچ گیا۔ مگر سب سے زیادہ بیتابی کا اظہار شہر کی حسین عورتوں کے حلقوں میں ہونے لگا۔ وہ سرگوشیوں میں ایک دوسری سے پوچھتیں "تم نے یہ مورت دیکھی ہے؟ لوگ کہتے ہیں کہ اس میں ایک ایسی دلکشی ہے جو کسی انسانی پیکر میں نہیں ہو سکتی" شہر کی ملکۂ حسن جس کے سامنے بڑے بڑے کج کلاہ رئیسوں کے سر جھکتے تھے سوچنے لگی۔ کیا واقعی وہ پتھر کی مورت مجھ سے زیادہ حسین ہے؟ "دیکھوں اس نوجوان صنّاع پر میرے حسن کا جادو نہیں چلتا اور وہ اپنی اس مورت کو چھوڑ نہیں دیتا"۔ وہ اٹھی اور اپنی بیش دستوں کو جو خوش رنگ پھولوں کی طرح حسین تھیں ساتھ لے کر سنگ تراش کے مکان پر پہنچی۔

نکھرے ہوئے آسمان پر جس طرح قوسِ قزح جلوہ پاش ہوتی ہے اسی طرح حسین عورتوں کا یہ جھرمٹ اپنی رنگین پوشاکوں میں سنگ تراش کی آنکھوں کے سامنے نمودار ہوا۔ اس نے شہر کی ملکۂ حسن کو پہلی دفعہ دیکھا تھا مگر اب اس کی نظروں میں ایک تحسین آمیز وارفتگی سی اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں وہ ایک عورت کو نہیں دیکھ رہا تھا اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ وہ حسن کے اس نظارے سے ایک بے تعلق تماشائی کی طرح لطف اندوز ہو رہا ہے۔ مگر تھوڑی دیر بعد اُسے خود بخود یہ احساس ہوا کہ یہ حسین عورت اس کی روح کو اپنے دام میں اسیر کر لینا چاہتی ہے۔ اور اُسے ہمیشہ کے لئے اس کے کام اس کے مجسمے سے چھین لینے کے لئے آئی ہے۔ معاً اس نے دیکھا کہ اُس عورت کی شوخ و شنگ آنکھوں میں بھی اس دلی کشمکش کا راز کھل گیا ہے؟ جو اُس کے سینے میں برپا تھی۔ اُس وقت اس کے بدن کے رُوئیں رُوئیں پر ایک کپکپی چھا گئی اور وہ سر سے پاؤں تک ایک نامعلوم خوف سے کانپ گیا۔ اس موقع پر وہ عورت ایک مجسّم سوال تھی۔ کیا وہ اس کے حسن کے سامنے جھک جائے گا؟ اس کے ایک طرف وہ حسین عورت کھڑی تھی اور دوسری طرف وہ مجسّمہ جو اس کی اپنی صنعت سے پیدا ہوا تھا۔ ناگہاں سنگ تراش نے مڑ کر مجسّمے کی طرف دیکھا اور مجسمے کی پاک نگاہ اور پُرجلال پیشانی کے سامنے اس کا سر فرطِ ادب سے خود بخود جھک گیا۔ وہ عورت ایک تلخ ہنسی ہنس کر چلی گئی کیونکہ صنّاع کی اس ایک جنبش سے اس کی قطعی شکست بالکل واضح ہو چکی تھی۔ لیکن وہ خود دیر تک مجسمے کے سامنے سرنگوں کھڑا رہا۔ اور جب اس نے دوبارہ اپنے اوزار ہاتھ میں لئے تو اس نے مجسّمے کے ہونٹوں میں ایک ادائے استقلال ابروؤں میں ایک تمکنت اور آنکھوں میں حلم گداز اور محبت پیدا کر دی۔

شہر کی ملکۂ حسن اُس شہزادے کی محبوبہ تھی جس نے صنّاع کو گراں بہا انعام دینے کا وعدہ کیا تھا اب وہ شہزادے کے پاس گئی۔ کہنے لگی۔ جس سنگ تراش پر زر و گوہر لٹانے کو تیار بیٹھے ہو۔ وہ محض کودن ہے اور اس کے مجسّمے میں طرح طرح کی خامیاں ہیں۔

دوسرے دن شہزادے نے اپنے درباریوں سے کہا "میری رائے اس صنّاع کو انعام دینے کے متعلق بدل گئی ہے مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ محض کودن ہے اور اس کے مجسّمے میں طرح طرح کی خامیاں ہیں"۔

نقادوں نے جب یہ سنا تو ان میں سے ہر ایک اپنی آنکھیں چمکا کر بولا "میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اس مورت میں ایک نقص ہے

اب ہمارے شہزادے نے وہی خامی دیکھ کر انعام کا وعدہ واپس لے لیا"

شہر کے بڑے قاضی نے اپنی ٹانگیں جریب زور سے زمین پر ماری اور اپنے مصاحبوں سے کہا "تمام سرکشوں کی تادیب قدرت اسی طرح کرتی ہے۔ خدا ہمارے شہزادے کو سلامت رکھے جس کے ایمان نے آخر اس صحیح فیصلہ کرا دیا۔"

عالموں نے اپنی کتابوں کے ورق الٹتے الٹتے اپنی نگاہیں اوپر اٹھائیں اور مسکرا کر کہا "ہم نے کہا نہیں تھا کہ اس شخص کا پول ایک دن کھل کر رہے گا؟"

علم و فن کی کتابوں پر عبور نہ ہو تو ایسے کاموں پر ہاتھ ڈالنا بے معنی ہے ہمارا روشن ضمیر شہزادہ لاکھ شہزادہ سہی پھر بھی کبھی صحبتوں میں فنون لطیفہ کی ماہیت پر ہمارے خیالات سن چکا ہے۔ بھلا ایسے شخص کو دھوکا دینے کی کوشش کرنا اس مجسمہ ساز کی خیرہ چشمی نہیں تھی تو اور کیا تھا

اور عام لوگوں نے خیال کیا "ہم تو اپنے دل میں اس مورت کو بہت کچھ سمجھے ہوئے تھے۔ خدا جانے عالموں نے اب اس میں کیا خرابی دیکھی ہے۔ خیر ہم سیدھے لوگ ان باتوں کو کیا جانیں۔ جو کچھ بڑے آدمی کہتے ہیں وہی ٹھیک ہے" اور اس کے بعد سنگ تراش کے متعلق ان کا جوش بالکل سرد پڑ گیا۔

صناع کو خود اس انقلاب کی کچھ خبر نہ تھی البتہ شروع میں اس بات پر ایک اطمینان آمیز حیرت اُس کو ضرور ہوئی کہ لوگوں نے اب کیوں اسے امن میں کام کرنے کے لئے تنہا چھوڑ دیا ہے۔ مگر چند ہی روز میں اسے معلوم ہو گیا کہ تمام شہر اس سے پھر گیا ہے اُسے اب مجسمے پر کام کرتے ہوئے کئی ہفتے بلکہ مہینے گزر چکے تھے۔ اس عرصے سے اُس نے اپنی بنائی ہوئی کوئی مورت یا کھلونا فروخت نہیں کیا تھا۔ اور اُس کے پاس جو سرمایہ تھا وہ ختم ہو چکا تھا۔ اب کبھی کبھی اس کے دن ایک روٹی کے ٹکڑے اور پانی کے پیالے پر اور کبھی فاقے میں گزرنے لگے۔ جو لوگ اُس کی مدد کرنا چاہتے وہ بھی یہ سوچ کر رک جاتے کہ کہیں شہزادہ ناراض نہ ہو یا قاضی کا قہر و غضب حرکت میں نہ آ جائے۔ اگر نقادوں اور شہزادوں کی رائے کے اثر سے کوئی آزاد رہا تو وہ چھوٹے بچے تھے جو اب بھی اسی جوش و خروش کے عالم میں اُس سے کھیلنے آتے تھے انہیں جب موقع ملتا اپنی ننھی ننھی جیبوں میں بادام اور منقے اور سیب اُس کے لئے بھر بھر کر لاتے۔ اور اُس کی آنکھیں بند کر کے یہ چیزیں خود اُس کے منہ میں ڈال دیتے۔

لیکن دراصل سنگ تراش کو اب خود بھی اپنی بھوک پیاس کا کچھ ہوش نہ تھا۔ اُس پر ان دنوں ایک بخار کی سی کیفیت طاری تھی جوں جوں مجسمے کی تکمیل کا وقت نزدیک آتا گیا وہ ایک عالم سرخوشی میں صبح سے شام تک اپنے کام میں مصروف رہتا۔ بچوں کی لائی ہوئی نارنگیاں بارہا اُس کے دریچے میں بیکار پڑی رہتیں اور اسے خبر بھی نہ ہوتی۔ بچے بھی اب سمجھ گئے تھے کہ وقت قریب آ پہنچا ہے وہ اُس کے کمرے میں آتے تو سرگوشیوں میں باتیں کرتے اور جب اُس نے سمجھا کہ کام ختم کرنے میں صرف دو ایک دن باقی ہیں اس نے بچوں سے کہہ دیا کہ اب وہ اسی دن ان کے ساتھ کھیلے گا جس دن مجسمہ تیار ہو جائیگا۔ بچے اب ہر صبح اس کے دروازے پر دستک دیتے۔ اس کا ہنستا ہوا چہرہ کھڑکی

میں سے باہر کو جھانکتا۔ اور وہ کہتا "کل" اور جب دو تین دن تک یہی جواب بچوں کو ملتا رہا تو وہ ہر روز اور زیادہ زور سے ہنستے اور چلے جاتے۔

آخر وہ دن بھی آگیا جب وہ یقین کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ مجسمہ آج ضرور تکمیل کو پہنچ جائے گا۔ اُس کی آنکھوں میں ایک فوق الفطرت چمک تھی۔ اُس کے ایک ایک عضو میں شعلۂ برق کی تڑپ تھی اور اُس کی سبک انگلیوں میں نسیم صبح کی روانی اور تیز گامی۔ آج اُس کے ہاتھ کے چھوٹے سے چھوٹے اشارے میں اس کی ساری روح سمٹ آئی تھی۔ وہ دن بھر اپنے کام میں لگا رہا اور جب رات ہوئی تو شہر والوں نے دیکھا کہ اس کا کمرہ شمعوں کی روشنی سے جگمگا رہا ہے۔ وہ اب بھی کام کر رہا تھا۔

ایک روشن پیشانی اور متبسم آنکھوں والے بچے کو نیند نہیں آتی تھی وہ دبے پاؤں اپنے بستر سے نکلا اور سنگ تراش کے مکان کے پاس پہنچ کر اُس نے آواز دی "کیا مورت تیار ہوگئی ہے؟" اور اندر سے صناع کی جوش بھری آواز آئی "ہاں، صبح سویرے"

تمام شہر خاموشی کی نیند سو گیا۔ سنگ تراش اٹھا اور اپنا دریچہ کھول کر اُس نے اس عظیم الشان سکوت پر ایک نگاہ ڈالی۔ خواب آلود گنبد اور مینار اندھیرے میں کھوئے کھوئے معلوم ہوتے تھے اور تمام بازار تاریک سایوں میں لپٹے پڑے تھے۔ اُس وقت اُس کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی اور عالم میں کھڑا ہے۔ کیا اس کی آنکھیں اس وسیع خاموش منظر کو آنے والی صبح کے عکس سے روشن ہوتے ہوئے دیکھیں گی؟ کل کا عجیب و غریب دن اس کے لئے کسی نئی زندگی کا پیغام لائے گا؟ اور یہ سوتا ہوا شہر جب بیدار ہوگا تو اُس کے تکمیل پائے ہوئے مجسمے کو کس نظر سے دیکھے گا؟ لیکن ابھی تو رات کی شمعیں جل رہی تھیں اور وہ صبح سے پہلے پہلے اپنا کام ختم کرنے کے لئے بے قرار تھا۔ مجسمے پر ایک ہی نظر اسے واقعات کی دنیا میں لے آئی۔ اور وہ پھر اپنے کام میں لگ گیا۔ گذشتہ و آئندہ کا ہر خیال محو ہو چکا تھا۔ اب پھر وہ خود نہیں رہا تھا صرف سنگِ مرمر کی ایک تصویر تھی۔

اور پھر وہ ساعت بھی آپہنچی جب اُس نے اپنے اوزار آہستہ سے فرش پر رکھ دیئے۔ کوچہ و بازار پر رات کی ظلمت ابھی پھیلی ہوئی تھی لیکن آسمان کا نیلا اب بکھرنے لگا تھا۔ مشرق نے رات کی سیاہی پر مرمر کی ایک دھندلی سی لکیر کھینچ دی تھی۔ صبح کے رنگ ابھی افق پر روشن نہیں ہوئے تھے۔ مگر بڑھتا ہوا اجالا سفید ریشم کے تار و پود کی طرح اپنے ہی نور سے جھلمل جھلمل کر رہا تھا۔

وہ مجسمے کے سامنے کھڑا ہو گیا اور اُس نے سر سے پاؤں تک پرسکون مسرت سے بھری ہوئی ایک طویل نگاہ اُس کے حسن پر ڈالی۔ جو نظارہ اُس وقت اسے دکھائی دیا اُس سے مسحور ہو کر وہ دم بخود رہ گیا۔ معاً اُس نے محسوس کیا کہ اس نے مرمر کا مجسمہ نہیں بنایا بلکہ ایک زندہ پیکر کی تخلیق کی ہے جس چہرے پر اس نے لطیف سے تبسم کا محض ایک اشارہ چھوڑا تھا۔ اُس پر ایک شگفتہ ہنسی کے آثار نمایاں ہو رہے تھے اور تھوڑی دیر بعد دانتوں کے وہ آبدار موتی بھی وہاں چمکنے لگے جن کی ساخت کسی انسانی تیشے سے نہیں ہوئی تھی۔ مورت نے اب اپنا قدم اٹھایا اور مرمر کی چوکی سے نیچے اتر آئی۔ اُس نے اپنی باہیں اپنے صناع کی طرف پھیلا دیں۔ اس کے مسکراتے ہوئے ہونٹ اب صاف

طلوع پر ملتے نظر آتے تھے

"میں نے تمہارے انتظار میں عمریں گزاریں"۔

سنگ تراش لپک کر آگے بڑھا اور اس سے ہمکنار ہو گیا۔ اس کے گرم گرم بازو اسے اپنے بدن کے گرد محسوس ہوئے۔ اس کے سانس کی مہک سے سنگتراش کے زرد رخسارے سرخ ہو گئے۔ اس کے سانس میں باغ جنت کے پھولوں کی خوشبو تھی۔

اور جب آفتاب کی پہلی شعاعوں نے اس منظر کو بے نقاب کیا تو وہ روشن پیشانی والا بچہ اور اس کے پیچھے دوسرے بچے سب سے پہلے سنگتراش کے کمرے میں داخل ہوئے۔

سفید جوہری پر مرمر کی مورت اپنے بے مثال حسن میں ملبوس کھڑی تھی۔ اس کے چمکتے ہوئے چہرے پر ایک آسمانی روشنی کی جھلک تھی جس سے تمام کمرہ منور ہو رہا تھا اور اس کے قدموں میں سنگتراش کا بے جان جسم پڑا تھا۔

حمید احمد خاں

درخت

میں سمجھتا ہوں میں کبھی نہ دیکھوں گا
کوئی نظم اتنی دلکش جیسے ایک درخت
ایک درخت جس کا بھوکا پیاسا منہ لگا رہتا ہے۔
شیریں زمین کی دودھ بھری چھاتی کے ساتھ
ایک درخت جو دن بھر خدا کو تکتا رہتا ہے اور اپنی پتوں بھری باہیں اٹھائے دعا مانگتا ہے
ایک درخت جو بہار کے دنوں میں پہنے رہتا ہے
چڑیوں کا ایک گھونسلا اپنے بالوں کے اندر
جس کے سینے پر کہر پڑا ہے
اور جو مینہ کے ساتھ مل کر مزے سے دن گزارتا ہے
نظمیں تو لکھ لیتے ہیں مجھ سے احمق بھی
لیکن ایک درخت کو صرف خدائے پاک پیدا کر سکتا ہے

گلچین



سال



ڈیلے کا بچپن

دیارِ محبوب

(ایک ریلوے اسٹیشن پر)

میری اُمیدوں کا مرکز ہے نظر کے سامنے ۔۔۔ کوئی ایسے میں خدارا آئے مجھ کو تھامنے
یہ دیارِ حسن ہے محبوب کی منزل ہے یہ ۔۔۔ جو سدا دامن کشِ دل ہے وہی منزل ہے یہ
خاکِ پاک اس شہر کی آئینہ دارِ حسن ہے ۔۔۔ اس کی رنگینی سے وابستہ بہارِ حسن ہے
یہ زمیں وہ ہے کہ جس پر آسماں کرتا ہے ناز ۔۔۔ بہرور ہے جس کے سجدوں سے سرِ عجز و نیاز
اس کے دامن میں نہاں ہے گوہرِ نایابِ حسن ۔۔۔ آسماں اس کو اگر کہیئے تو وہ مہتابِ حسن

جس کے جلووں سے منور میرے دل کی کائنات ۔۔۔ حاصل تھی مجھے جس کی نگاہِ التفات
خوشہ چیں جس کے تبسم کی بہارِ گلستاں ۔۔۔ جس کی منت کش مرے جذبات کی رنگینیاں
یاد بھی جس کی تصور کو پرِ پرواز ہے ۔۔۔ آہ! وہ جس کو مرے وقفِ وفا پر ناز ہے

ہُو کا عالم چاندنی پھیلی ہوئی ٹھنڈی ہوا
کون جا کر اک مسافر کا اُسے پیغام دے
آج اس غربت میں میرا ہمنوا کوئی نہیں

میں وطن سے دُور ہوں مارا ہُوا آلام کا
کس کو اُس محفل میں اذنِ باریابی مل سکے؟
بےکسی ہے اور میں درد آشنا کوئی نہیں

چاند اے زینت فزائے آسماں تجھ پر نثار
تُو کہ ہے دانائے رازِ گردشِ ایام جا

میرا دل تیرے حوالے میری جاں تجھ پہ نثار!
اس حریمِ ناز میں لے کر مرا پیغام جا

جلوہ گاہِ حسن میں جا کر نہ گھبرانا کہیں
اے حسیں قاصد بہت ممکن ہے وہ جانِ شباب
اس کے جلووں سے تری کرنیں نہ ہونے پائیں مس
خواب کی صورت میں آہستہ سے اس کے پاس جا
اس سے ملنے کی کہیں دل ہی میں حسرت رہ نہ جائے
ہو سکے تو اپنی کشتی میں بٹھا لانا اُسے

اپنے داغ آلودہ چہرے سے نہ شرمانا کہیں
میری قسمت کی طرح اس وقت ہو مصروفِ خواب
ورنہ تجھ کو میری نظروں سے گرا دے گی ہوس
خواب ہی میں جا کے اُس کو میرا حالِ دل سُنا
میرا ذوقِ دید محرومِ سعادت رہ نہ جائے
یعنی جوئے کہکشاں سے لے کے آ جانا اُسے

حفیظ ہوشیارپوری

ازکجاست تابہ کجا

یہ ذکر لندن کا ہے۔

شام کے پونے آٹھ بجے کے قریب لندن کے مشہور چوک پکیڈلی کے ایک طرف الگ کھڑے چند ہندوستانی نوجوان خود اپنی جیبیں ٹٹول ٹٹول کر ہتھیلی پر شلنگ اور پنس جمع کر کے حساب لگا رہے تھے کہ شام خوش دلی کے لئے کل مشترکہ سرمایہ کیا ہے؟ آخر بے اختیار ہنس دیئے کہ تھیٹر تو کجا کل جمع پونجی متوسط ترین اکل و شرب کے لئے بھی کافی نہ نکلی۔ مگر وعدہ کر چکے تھے کہ جو کچھ کریں گے اکٹھا کریں گے۔ اس لیے ہر پیش شدہ تجویز کی ووٹوں سے چھان بین کر رہے تھے۔ پکیڈلی کی دو چار چھوکریاں ان کی طرف معنی خیز مسکراہٹ اور شوق افزا نگاہیں پھینکتی ہوئی گزر گئیں مگر یہاں تو "یاراں فراموش کردند عشق" والا معاملہ تھا۔ کسی کی آنکھ نہ ملی کسی کا قدم نہ اٹھا۔ جب ایک منچلے نے یہ تجویز کی کہ نہ کھانا نہ تماشہ یہ شام محض BEER اور SAN DWI CH کی نذر کی جائے تو بحث پھر پوری پارلیمنٹری آب و تاب سے چل نکلی۔ ایک نے کہا کہ SANDWICH کو محذوف کر دو۔ دوسرے نے کہا کہ یہ آنریبل ہاؤس ہندوستان کی لازوال گزشتہ شان کو مدنظر رکھتے ہوئے فیصلہ کرے کہ انسان پیے تو خوب پیئے ورنہ برت رکھے اور اس لیے میرا ووٹ ہے کہ BEER کو وعلیکم السلام کہا جائے۔ تیسرے نے کہا کہ میں پوچھتا ہوں BEER سے ہونٹ تر کر لیں گے نشہ اندر سے نکالیں گے اور شام گزر جائے گی۔ اس لئے BEER ضرور ہو مگر تھوڑی ہو۔ یہ سب ابھی اسی بحث میں تھے کہ ایک خوش رو ہندوستانی نوجوان تیزی سے قدم بڑھاتا ہوا ان کی طرف عازم ہوا۔ اور پہنچتے ہی کہنے لگا۔

نووارد۔ کیا شیطان تمہاری کچھ مدد کر رہا ہے؟

ایک۔ کیوں۔

نووارد۔ اس لئے کہ اگر کر رہا ہے تو ضرور تم میں سے کسی کے پاس ایک دو پونڈ فالتو ہوں گے وہ مجھے دے دو۔

دوسرا۔ شیطان صاحب نے تو دیوالہ کی درخواست دے رکھی ہے۔

نووارد۔ مجھے پہلے ہی یہ توقع تھی۔ خدا ہم غریبوں کی سنتا نہیں (AND THE DEVIL FAILS YOU)

تیسرا۔ پھر اب کریں تو کیا کریں؟

نووارد۔ کچھ نہ کرو میرے ساتھ چلو۔ مگر اس شرط پر کہ گیارہ بجے سب نفرو ہو جاؤ۔ میری بھٹیاری ذرا تلخ مزاج ہے۔

سب۔ منظور۔ مگر دو شرطیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ سنما سٹار یا ایکٹرس کا تذکرہ نہ ہو اور سیاسیات خارج از بحث رہیں۔ دوم

یہ کہ خرچ سب مشترکہ ہو۔

نووارد۔ .O.K

۲

(ہندوستانی گھروں میں ان نوجوانوں کی بہنیں، بھابیاں، خالائیں، پھوپھیاں، مائیں، نانیاں سب خیال کرتی ہوں گی کہ ہمارا بچارا نھا ضرور کسی مس کا شکار ہو گیا ہوگا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ ہزاروں ذہنی تصویریں ان کے پیش نظر ہوں گی کہ بس کسی چڑیل مس نے شراب پلا پلا کر اپنا دیوانہ بنا رکھا ہے کبھی تو خط دیر میں آتا ہے اور وہ بھی چار سطروں کا منتیں مانگتی ہوں گی کہ بچ کر چلا آئے تو اجمیر شریف چڑھاوا چڑھائیں۔ چچا کو رہ رہ کر یہ خیال آتا ہوگا کہ اب اپنی بیٹی کا کسی اور جگہ ارادہ کروں (ہندوستانی والدین بیٹیوں کے لئے جگہ تلاش کرتے ہیں شوہر چاہے کیسا ہی ہو) باوا اگر تھیر کے گھر میں ہوئے تو صاف کہتے ہوں گے "عجب پاجی ہے کہ خرچ اٹھائے جا رہا ہے اور امتحان پاس کرنیکا نام نہیں لیتا۔" اور اگر مزاج کا پارہ ذرا کم تیز ہوا تو دبی زبان سے یوں بھی فرما دیتے ہوں گے "بھئی آخر کیا کرے۔ لندن نئی جگہ مہنگی جگہ ابتدا کا گھر خرچ نہ کرے۔ نیل نہ ہو تو اور کیا کرے")

۳

یہ نوجوان ایک سستی جگہ سے کچھ کھانے پینے کی چیزیں لے کر نووارد کے گھر پہنچے۔ لینڈ لیڈی (LAND LADY) کی بیٹی نے ان کو کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ کر اپنا فرض سمجھا کہ کرایہ دار (یعنی مسٹر نووارد) سے دریافت کرے کہ کیا یہ لوگ کچھ SUPPER کے متلاشی ہوں گے؟

نووارد۔ لوسی تھینک یو۔ مگر سپر ہمارے ساتھ ہے اور ہم تو محض باتوں سے پیٹ بھریں گے۔ ان سب شاہزادوں کے پاس آج کل ٹین (یعنی نقدہ، وحرمتہ) کی عارضی کمی ہے۔

لوسی (دلفریبی سے مسکرا کر) یوں تو نہ کہئے کہ یہ ان PRINCES کا تصور ہے یوں فرمائیے کہ وہ کھیت جس کا نام باپ ہو آج کل زرخیز نہیں۔

نووارد۔ تصحیح کا شکریہ۔ اسی لیے تو میں کہتا رہتا ہوں کہ مجھے تم سے ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے۔

لوسی۔ گڈ نائٹ۔

اس مس کے پیٹھ موڑنے پر گفتگو یوں شروع ہوئی۔

ایک۔ غنیمت ہے۔ اس سے تو جان بچی۔

دوسرا۔ کس کی؟

تیسرا۔ یہ سلسلہ گفتگو قطعی ممنوع ہے۔ آج شام زبان کے لیئے عورت اور شراب دونوں حرام ہیں۔

نووارد۔ یہ بتاؤ کہ کھاؤ گے کس وقت؟

سب۔ جب آنتیں بالکل قل ہواللہ پڑھیں گی۔ اس سے پہلے ہرگز نہیں۔

نووارد۔ میرا قرآن تو قریباً ختم ہے۔

ایک۔ میرا بھی۔ دوسرا۔ سچ پوچھو تو میرا بھی۔ تیسرا علیٰ ہذا القیاس۔

اس پر سب کے سب خوب ہنسے اور خوشی خوشی ماحضر کو گھٹنوں پر رکھی ہوئی طشتریوں میں رکھتے گئے اور کھاتے گئے یہاں کیا؟ دس منٹ میں چاروں میں وہ دو BEER کی بوتلیں اور کافی مزہ دار SANDWICH گویا درٹ کے منہ میں زیرہ ہو کر رہ گئیں۔ مگر ان لوگوں کی بشاشت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ سب کے سب صحت کی دولت سے مالا مال تھے اور اس سے بڑھ کر یہ تھا کہ خداداد ذہانت کی برقی روشنی سے چہرے تمتما رہے تھے۔ باتیں کرتے کرتے ایک نے فارسی شاعری کا ذکر چھیڑ دیا

نووارد۔ واہ حضرت! کس بیابان میں جا گھسے؟

ایک۔ بیابان تو ضرور ہے۔ مگر اس میں بلا کے ساحر آباد ہیں۔ سچ پوچھو تو خدا کی بنائی ہوئی دنیا کو رد کر کے جو خیالی دنیا فارسی شاعروں نے کھڑی کر دی ہے وہ قطعی بے مثل ہے۔

دوسرا۔ یہ کیسے؟ کیا یونانیوں کے اور ہندوؤں کے دیوی۔ دیوتاؤں کے قصے کچھ کم حیرت خیز ہیں۔ حالاتِ موجودہ کو کس خوبی سے منسوخ کر کے ان لوگوں نے محض زبان آوری کی لیاقت کے جادو سے ایک مفروضہ دنیا کو انسانی دلوں پر حکمران کر دیا۔ اور فارسی والوں میں اصلی تخیل کتنا نحیف و نزار ہے۔ "ہمہ اوست" "از ہمہ از دوست" کے دو عامیانہ جملوں کو فصاحت کی شراب پلا پلا کر ان لوگوں نے متوالے پن کی شان میں اضافہ ضرور کیا ہے۔ مگر غائر نظر سے دیکھو تو اور کچھ بھی نہیں۔ پل میں فنا ہوتے ہیں۔ پل میں بقائے دوام کے دعوے دار بنتے ہیں اور عمر بھر اسی فنا و بقا کی بے معنی ترشی کو مینائے فراست سے انڈیلتے ہیں اور پھر اسی میں ڈال دیتے ہیں۔ ایک آدھ نے غم شکنی بھی کی ہے۔ مگر فارسی شاعری میں تصوف کا سونا تھوں کا توں موجود ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ فارسی والوں کے پاس۔ خدا معشوق۔ اور مے کے علاوہ صرف آئینۂ حیرت۔ جبر و اختیار اور فنا و بقا کا دماغی سرمایہ تھا اور باقی خیر صلا۔ جہاں تک ان سے ممکن ہو سکا۔ ان چند تانوں کو وہ لمبا کرتے رہے مگر . . . . . .

تیسرا۔ اب بس بھی کرو کہ لکچر دیتے چلے جاؤ گے؟ اس بحث میں میں بھی حصہ لینا چاہتا ہوں؟

ایک دگاتے ہوئے) میں پڑ رن تورے پیاں۔

معاف کرو

تیسرا۔ معاف کیا۔ اچھا اب میری سنو کیا شعر کو اس کے معنی کے لئے پڑھنا اور پرکھنا خالص گدھا پن نہیں؟ ایشیائی قسم کی انتہائی ذ ...ت

یہ ہے کہ حُسن کو اور حسن آفرینِ فنِ انسانی کو نیک و بد کی ترازو میں تولا جاتا ہے۔ اور مزید براں یہ کہ شاعر خود اس ہمہ دانی ہمہ فہمی کے دھوکے میں مبتلا ہو کر گویا واعظ بن جاتے ہیں اور بعض دفعہ واعظ سے بڑھ کر معینِ معرفت کے ترجمان ہونے کے دعوے دار۔ شاعر تو خیر تھا ہی ان ترانیوں کے لئے مگر لوگوں کی عقل کا کیا کہیئے کہ ان ابلہ فریبیوں کو حقیقت کا کامیاب نقشہ کاری سمجھتے ہیں میری رائے میں شعر کو پرکھنے اور اس سے لطف اٹھانے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ کیا شاعر نے الفاظ کے سنگ ریزوں کو یوں جڑا ہے کہ وہ الماس و زمرد کو مات کر دیں؟ شاعر لفظوں کا صناع ہے۔ جیسے جوہری ہیرے اور یاقوت کا۔ دونوں اپنے اپنے فن کے کاریگر ہیں۔ کاریگر کی لیاقت کا معیار اس خیال سے کرنا کہ چیز قیمتی ہے۔ گویا اس کی کاریگری کا خون کرنا ہے۔ آپ لوگ جو مضمون پڑھتے ہیں۔ گویا یہ کہتے ہیں کہ قطب صاحب کی لاٹ اگر سونے چاندی کی بنی تو بہت زیادہ پسندیدہ ہوتی۔ قطب صاحب کی لاٹ کی قدر و منزلت اس لئے کم نہیں ہو جاتی کہ وہ اصل و محض اینٹ پتھر چونے اور گارے کا مجموعہ ہے۔ اس کی اصلی شان یہ ہے کہ کاریگر نے اینٹ پتھر کو اپنی حسن آفرین طبیعت سے وہ مرتبہ دے دیا ہے جو کروڑ من سونے کو حاصل ہونا ناممکن ہے یہی حال شاعر کا ہے۔ اپنی کیمیا گری سے مٹی کو سونا کرتا ہے۔

درسایہ مجو دل عراقی
کاں ذرہ بآفتاب پیوست

نو وارد بھئی سنو بحث نہ کرو۔ تم سب جانتے ہو کہ اس مضمون میں مجھے بھی کچھ تشدد ہے اور وہ مبالغہ جو ابھی (ایک کی طرف مخاطب ہو کر) تم نے کیا ہے دانستہ کیا ہے۔ مجھے خوب علم ہے کہ تم چاہتے تو شاعری کی TECHNIQUE کی ہجو کر دیتے اور مضمون کی خوبی کے مدح میں قصیدے کے قصیدے لکھ ڈالتے۔ مگر ایک شعر مجھ سے بھی سن لو۔ عرفی کا ہے۔

مرا ز چشم تو ہر شیوہ کہ بایدہست
ہمیں نہفتہ نگہ ہائے آشناست کہ نیست

یہ ہے شاعری کا کمال کہ کتنے مختصر لفظوں میں کتنی خوبصورت داستان لکھ دی ہے۔ کیا ہست و نیست کا تلازمہ ہے۔ سب کچھ ہے اور پھر کچھ بھی نہیں اور محض اس لئے کہ شریر آنکھیں شرارت سے باز رہیں تو بھی ستم کر جاتی ہیں۔

سب ۔ واللہ لاجواب شعر ہے۔ پھر کہو۔

نو وارد۔ پھر وہی شعر دہراتا ہے۔ سب کے سب لہرا لہرا کے گنگناتے ہیں۔ گویا مبہوت سے ہو جاتے ہیں اور یہ عالم کچھ دیر تک طاری رہتا ہے پھر سب کے سب بے اختیار ہنس دیتے ہیں۔

نو وارد۔ واللہ ہمارے سب کے دماغ کیا ایک سانچے میں ڈھلے ہیں؟ یا تو اس شعر کا لطف لے رہے تھے اور یا یہ خیال آ گیا کہ عرفی بھی کس دنیا میں رہتا ہو گا؟ "تغافل ہائے تمکیں آزما" والی دنیا کے رہنے والے بچاروں کے لئے نگاہ بے محابا بڑی دولت تھی۔ لندن میں کوئی

ایسا مفلس نہیں جسے یہ امیری میسر نہ ہو۔ واقعی ہندوستان سخت نادار ہے۔

سب۔ تو گویا یورپ کا یہ سبق ہمارے دلوں میں سب سے زیادہ پائدار ہے؟

نووارد۔ بیہودہ مت بکو تم جانتے ہو کہ میرا نظریہ یہ ہے کہ ہم زندگی سے سیکھنے کچھ نہیں آئے بلکہ زندگی کو کچھ سکھانے آئے ہیں یہاں ہم پارسائی کی تلقین کریں گے جب گھر جا نکلیں گے تو زندگی کا درس دیں گے۔

سب۔ اپنا فضول فلسفہ رہنے دو۔ لو اب چلتے ہیں بھئی تمہاری بدولت خوب شام گذری۔

ایک۔ ہاں بھئی شکریہ۔ پیسے بچ گئے۔ وقت کٹ گیا۔

دوسرا۔ یوں کہو کہ وقت زندہ ہو گیا۔

تیسرا۔ واللہ اس تفریح سے کل کے کام کے لئے جان میں جان آگئی۔

ایک۔ حضور تم تو کل رستم بن کر ریاضی کے اسفندیار کو زیر کر لوگے مگر ہمارا اقتصادی پہلوان ہم سے نہیں کچھ اتنا مداستیاناس کرے۔ اس گول چاندی کی ٹکیہ کا جس کا نام روپیہ ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ روپیہ آدمی کے لئے ہے یا آدمی روپیہ کے لئے ہے۔

سب۔ بھئی ایک شعر اور سنا دو تب جائیں گے۔

نووارد۔ سنو۔

ادب زمن طلبد شوخ آشنا روئے — کہ از تبسم اوے شود حیا گستاخ

سب۔ واللہ کیا موتی پروئے ہیں۔

دوسرے مصرع کو سب بار بار پڑھتے ہیں اور جھومتے ہوئے خدا حافظ خدا حافظ کہہ کر ہشاش بشاش رخصت ہونے کو تھے کہ نووارد بولا۔

نووارد۔ ایک شعر اور سنتے جاؤ۔

درخواب غلط بماند خسرو
کایں حال مرا نہ بود یا بود

سب چلے جاتے ہیں۔

۴

لوسی۔ میں آسکتی ہوں؟

نووارد۔ آئیے۔ کیوں خیر ہے؟

لوسی۔ مجھ سے غلطی ہوئی ہے معاف کیجئے۔

نووارد۔ کیا؟

لوسی۔ مجھے نیند نہ آرہی تھی۔ اس لئے میں پڑھنے لگ گئی۔ اتفاقاً اس پردہ کے پیچھے سے گزری تو آپ لوگوں کو دیکھا عجب حالت تھی۔ آپ کچھ کہہ رہے تھے۔ آپکے دوست اس بات کو جھوم جھوم کر دہرا رہے تھے۔ میں اس SCENE کو دیکھ کر ہل نہ سکی۔ گویا پاؤں زمین میں گڑھ گئے۔ آپ اپنی زبان بول رہے تھے اس لیے یہ تو آپ کو شبہ نہ کرنا چاہیئے کہ مجھ میں پرائی بات سننے کی ذلیل جستجو تھی۔ مگر پھر بھی میں معافی مانگتی ہوں۔ امید ہے کہ آپ برا نہ مانیں گے۔

نووارد۔ لوسی تم کیسی باتیں کرتی ہو، معافی کا اور برا ماننے کا کیا سوال ہم تو ایسے منہمک تھے کہ ہم میں سے تو کسی نے محسوس نہیں کیا کہ پس پردہ بھی کوئی ہے۔

لوسی۔ یہی تو میں تعجب کرتی ہوں کہ وہ کیا چیز تھی جس نے آپ کو اس قدر بے خود کر رکھا تھا۔ آپ لوگوں کے چہروں پر اس وقت ایسی SPIRITUAL - LIGHT تھی جو اپنے وطن میں مجھے کبھی شگفتہ سے شگفتہ رخ دلکش میں نظر نہیں آتی۔ دوسروں کو خوش دیکھ کر کتنی خوشی ہوتی ہے۔

نووارد۔ لوسی ہم فارسی زبان کے اشعار کو پڑھ کر ان کا لطف لے رہے تھے۔

لوسی۔ کیا عمر خیام کے اشعار تھے ؟

نووارد۔ عمر خیام بچارا کیا یہ شعر لکھتا۔ ایک شعر عراقی کا تھا۔ دو عرفی کے۔ اور ایک امیر خسرو کا۔

لوسی۔ آپ کو نیند نہ آرہی ہو تو مجھے ترجمہ سنا دیجئے۔ مجھے سخت بے تابی ہے۔

نووارد۔ نیند تو نہیں آرہی مگر ان اشعار کا ترجمہ ہو نہیں سکتا۔ البتہ تم کہو تو دو ایک اور کا ترجمہ سنا دیتا ہوں۔

لوسی۔ ضرور سنائیے۔ کوئی شراب کا یا گلاب کا شعر ہو۔

نووارد۔ کیا تمھیں نیند نہیں آرہی ؟

لوسی۔ ہرگز نہیں۔ لائیے آپ کا کوٹ اتار دوں۔ آپ ڈریسنگ گون پہن لیجئے۔

نووارد۔ تھینک یو۔

لوسی۔ نہایت بے تکلفی سے کوٹ وہ اسکٹ اتار لیتی ہے گرم ڈریسنگ گون اٹھا لاتی ہے۔ اور نوجوان اپنے گلے کو کالر نکٹائی کی قید سے آزاد کرتا ہے۔

نووارد۔ سنو ایک شعر یہ ہے۔

ترسا بچۂ، شوخے۔ شنگے بشکر افشانے
در ہر خم زلف او گمراہ مسلمانے

(شعر سنا کر ترجمہ بھی کرتا جاتا ہے۔ اور اس کے بالوں سے بھی کھیلتا جاتا ہے)

ازدیر بروں آمد، بہ خوبی خود سرمست
ہر کس کہ بدید او را دالہ شد و حیرانے

(پھر ترجمہ کرتا ہے۔ ایک اور غزل میں ایک شعر یہ ہے۔

شکر زلبش می چیں، تا چند ز کفو دیں۔ در زلف و رخ او بیں، گبرے و مسلمانے

(پھر ترجمہ کرتا ہے)

لوسی۔ یہ شعر تو ایکٹنگ کے قابل ہے۔

چنانچہ ایکٹنگ ہوتا ہے مگر وہ نہیں جس کا ہندوستان میں ٹیمپی بچاری ماؤں کو، بہنوں کو ڈر لگا رہتا ہے۔ کیونکہ زمانہ ترقی پذیر ہے۔ نہ دل آتا ہے نہ دل جاتا ہے جو ہوتا ہے وہ فطری سادہ دل سے اور ایسی بھولی طرح کہ ملال کا۔ گناہ کا گمان تک نہ ہو۔

لوسی۔ کاش کہ میں آپ کا کافی شکریہ ادا کر سکوں (جمائی لے کر) نیند بھی کیا فضول چیز ہے۔ کاش جاگتے چلے جائیں، تم عمر پڑھے ہو تو بچوں سے بڑھ کر بھولے معلوم ہوتے ہو۔ گڈ نائٹ۔

نووارد۔ گڈ نائٹ۔

۵

اجمیر شریف چڑھاوا چڑھے کو کئی سال گزر گئے چچا کی بیٹی کے لئے جگہ کی تلاش کا سوال پیدا ہی نہ ہوا۔ گھر کا کام گھر ہی میں ختم ہوا۔ بادا کی تمکین میں فارغ البالی کے آثار ہیں۔ کیونکہ گو کماؤ بیٹے نے الگ کوٹھی میں رہنا پسند کیا مگر صاحب بیٹے نے سعادت مندی کو کچا نہ نگلا۔ باپ کی ماں بہنوں کی آؤ بھگت میں توقع سے زیادہ خلوص تھا چھوٹی بہن البتہ کبھی کبھی کہہ اٹھتی کہ خدا جانے شادی کے بعد آکاسیاں کے مزاج میں وہ چلبلا پن کیوں کم ہو۔ ہاں ہے جو ولایت سے واپس آنے پر ہونٹوں اور آنکھوں سے فوارے کی طرح اچھلتا دکھائی دیتا تھا۔ مگر اور سب کو کامل اطمینان تھا کہ سلیم طبائع پر لندن کا جادو کارگر نہیں ہوتا۔ سمجھنے والے خوب سمجھ رہے تھے کہ ہندوستانی سوشل گرد و غبار اپنا کام کر رہے ہیں مگر اس معاملہ میں کوئی کر کیا سکتا ہے جس طرح گمل کمرے کی ولایتی چاندی کی چیزیں روزانہ جھاڑ پونچھ کے باوجود ماند پڑ جاتی ہیں اسی طرح وہ ذہین خوش رو چہرے جن پر چار پانچ سال لندن نے محنت سے جلا دی ہو ہندوستانی گھروں میں ہندوستانی حالات کے دباؤ کے افسردہ کن اثر سے بچ نہیں سکتے۔ سب سے پہلے بوٹ بدہم ہونے شروع ہوتے ہیں اور پھر یہاں تک نوبت پہنچتی ہے کہ کبھی ہے اور کبھی ندارد۔ بوٹ سوٹ۔ دل۔ دماغ۔ سب کو ہند کی معاشرتی پھپھوندی کھا کر چھوڑتی ہے۔

ہاں مگر کبھی کبھی اگر دوست مل بیٹھیں تو .. ..

۶

یہ ذکر ہندوستان کے ایک شہر کا ہے۔

(نام نہ شہر کا لکھا جائے گا نہ کسی شخص کا۔ نام ان کے ہوتے ہیں جو کچھ ہوں اور جو کر سکیں۔ جو وطن سے باہر کبھی زندہ رہے ہوں مگر وطن میں محض چلتی پھرتی لاشیں ہوں۔ کیا ان کا نام۔ کیا ان کے شہر کا پتہ؟ مگر یہ داستان سیکڑوں گھروں کی زندہ تاریخ ہے)

تماشا: آنے پر مسٹر نووارد معمول سے قدرے زیادہ مستعلیق طرز میں شام سے ذرا پہلے موٹر میں سٹیشن پر جانے کے لئے طیار ہیں کہ چھوٹی بہن آنکلتی ہے۔

چھوٹی بہن۔ آکامیاں! آج تو آپ بہت بشاش معلوم ہوتے ہیں۔ کیا بات ہے؟

نوواردؔ۔ منّی میرے تین دوست آرہے ہیں صرف ایک رات کے لیئے لنڈن میں ہم چاروں بہت دیر یک جا رہے۔ سب کے سب لائق تھے اور اب کامیاب ہیں۔ مجھے بے انتہا شوق ہے کہ ان سے مل کر گپ بازی ہوگی۔

بیوی۔ کھانے کے لئے میں نے کہہ دیا ہے۔ پلاؤ ہوگا اور دو ایک سالن مچھلی اور کباب تو خیر ہوں گے ہی۔ اور کچھ چاہیں تو بنوا دوں؟

نوواردؔ۔ سنئے۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ کھانا وہ لوگ شاید ہی کھائیں اور تکلف کا کھانا۔ اگر آپ میری سنیں تو ہرگز طیار نہ کرائیے۔ سینڈوچ کافی رکھوا دیجئے۔

بیوی۔ یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ کے دوست آئیں اور کھانا نہ بنواؤں؟ سینڈوچ بھی بھلا کوئی کھانے کی چیز ہے۔ مگر آپ اصرار کرتے ہیں تو ضرور تیار ہو جائیں گے۔

چھوٹی بہن۔ بھابی! کیا آپ آکامیاں کے دوستوں سے بھی پردہ کریں گی؟

بیوی۔ منّی! پردہ ہے تو سب سے ہے۔

نوآرد کے چہرے پر ایک غیر معلوم شانئے کے لئے بشاشت مفقود ہو جاتی ہے۔ مگر چھوٹی بہن اور بیوی کی طرف ہاتھ ہلاتا ہوا موٹر میں سوار ہو جاتا ہے۔

سٹیشن پر چار دلی دوستوں کا ملنا۔ عرصے کے بعد ملنا اور تھوڑے عرصے کے لئے ملنا!!! "ہیلو" "ڈیم یو" "ابے پٹھو" "ابے رندی فیل" "ابے شیطان کے گرو" اور اسی قسم کی بیسیوں بے تکی صلواتوں کے گویا طوفان کا بپا ہونا تھا۔ کہاں پرانی تہذیب کہ دیر کے بعد ملو تو آب دیدہ ہو کر ملو۔ کہاں یہ نیا طریقہ کہ دلی مسرّت کو بدتمیزی کا برقع پہنا دو۔ ہاتھ بھی چلے۔ زبان بھی چلی۔ مگر اس تڑاق پڑاق اور گالی گلوج میں طبیعتوں سے ہندوستان کا رنگ ڈھل گیا۔ سامان ملازموں کے حوالے کرکے موٹر کے پاس پہنچے۔ بھلا نوآرد کو خود اپنی موٹر کون چلانے دے! ایک کرایک نے WHEEL کو تھاما۔ دوسرے نے نوآرد کو پچھلی سیٹ میں دھکیلا۔ جو موٹر چلانے بیٹھا وہ خوشی سے بولا PETROL بہت ہے پہلے بیس پچیس میل

کا چکّر لگائیں گے یہ جادہ جا بفضا فات کے باغ دیکھے۔ رات ہوئی تو شہر کی سڑکوں پر گھومے۔ ایک RESTAURANT سے BEER کی دو بوتلیں اٹھا لائے اور پھر رات کے نو بجے گھر پہنچے۔ خدمتگار نے عرض کیا کہ حضور کھانا لاؤں کہ ایک کہنے لگا نہیں کھانا نہیں صرف سینڈوچ لاؤ۔ دوسرا کہنے لگا ہاں دوست آج لندن کی رات مناؤ۔ کھانے کو GOOD BYE تیسرا چیخا کہ یہ ہو جائے تو گویا کہتے مگر یارو یہی شرط کہ عورت کا لفظ زبان پر نہ آئے۔ خوش طبعی کے اس ہلڑ میں میزبان بھی بھول گیا کہ زندگی میں سوائے دوستوں سے مل کر خوش ہونے کے کوئی اور فرائض بھی ہوتے ہیں۔ اور یہ چاروں گویا پھر طالب علم ہو گئے۔ نہ کوئی قائم مقام کلکٹر رہا نہ کوئی کامیاب بیرسٹر، نہ انجنیئر، نہ ڈاکٹر۔ سینڈوچ BEER کا گلاس اور باتیں کرکٹ میچ کی باتیں۔ جہاز کے سفر کی باتیں۔ استادوں کی باتیں بچھڑے ہوئے ہم سبق کسی مدراسی کی بنگالی کی باتیں۔ باتیں اور بات بات پر قہقہے۔

ایک۔ ارے وہ مرہٹا چند کہاں ہے جو انگریزی میں نظم لکھا کرتا تھا۔

دوسرا۔ سنتا ہوں کہ اس کی دو چار نظمیں انگریزی رسالوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ مگر یہ بھی سنا کہ بیوی سے وہ بھاگ نکلا۔

تیسرا۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔ شاعری اور بیوی متضاد چیزیں ہیں۔

نووارد۔ سچ کہتے ہو۔ اسی لئے میں TENNYSON کو بڑے شاعروں میں شمار نہیں کرتا۔

دوسرا۔ یہ تمہارا ظلم ہے۔ ٹنی سن لاجواب چیزیں لکھ گیا ہے۔

نووارد۔ (جلدی سے) لعنت بھیجو اس کی لاجواب بکواس پر جو شخص یہ لکھ سکتا ہے۔

LET MORE + MORE OF REVERENCE IN US DWELL وہ کبھی شاعر ہو ہی نہیں سکتا

ایک۔ آج تو تم بہت مبالغے پر تلے ہوئے ہو۔

نووارد۔ اچھا بحث کو جانے دو۔ کیا وہ تمہیں یاد ہے جس میں حُسن کا دعویٰ ہے کہ خدا اپنے ستارے سے اترے AND BOW BEFORE THE WONDER OF MY EYES اس کے بعد کی انگریزی گفتگو کا لطف اردو میں بیان ہونا ناممکن ہے۔ انگریزی شاعری کا طوفان امنڈ پڑا۔ طالب علمی اور شباب! کسی نے کچھ پڑھا کسی نے کچھ۔ پورے دو گھنٹے گزر گئے اور خیال تک نہ ہوا کہ رات آدھی جا چکی ہے۔ آخر ایک نے فرانسیسی شاعر BAUDLAIRE کا ذکر چھیڑا تو نووارد بولا۔

نووارد۔ عرفی نے "خندۂ گلہائے بدنامی" کی ترکیب باندھی ہے مگر BAUDLAIRE کے FLOWERS OF EVIL کی گرد تک کو نہ پہنچ سکا۔

دوسرا۔ اچھا تو اب یہ گلِ بدکرداری کاشت کرو کہ پاؤں پھیلا کر سو جاؤ۔

سب مل کر نووارد کو تو گھر کے اندر دھکیلتے ہیں اور کہتے جاتے ہیں کہ تم سوتے رہنا ہم صبح چل دیں گے " نائٹ نائٹ اولڈ بائے"۔

اور " DAMN GOOD TIME WE HAVE HAD " کا شور مچ گیا۔

۷

نووارد۔ دعوتوں کی خوشی کی شراب سے مخمور پلنگ کمرے میں داخل ہوتا ہے تو کیا دیکھتا ہے کہ بیگم بیدار ہیں۔

نووارد۔ ارے۔ تم جاگتی ہو؟۔

بیوی۔ کون سو سکتا ہے۔ پکا پکایا کھانا آپ لوگوں نے غارت کیا۔ یہ بھی کوئی طریقہ ہے کہ کھانا برباد کیا۔ نیند گنوائی اور پوری دو قوبیں تم لوگ چٹ کر گئے۔ لندن میں یہی سیکھا ہو گا ان سب نے۔ مجھ سے تو رہا نہ گیا۔ پردے کے پیچھے سے جھانکا تو کیا دیکھتی ہوں کہ اچک اچک کر انگریزی میں سب کے سب کچھ بکے جا رہے ہیں۔ مجھے تو دیوانے معلوم ہوتے تھے۔ کسی اور کا بھی خیال کیا ہوتا تم لوگ تو بچوں سے بدتر ہو گئے۔

انسانی دماغ کا گراموفون بعض وقت عجب طرح بجتا ہے۔ بیگم کی یہ عقل کی باتیں (ہندوستانی عقل ہندوستانی غصے سے کہیں زیادہ زہر آلود ہوتی ہے) سنتا جاتا تھا۔ مگر اس کے دماغ میں وہ بالکل بھولے ہوئے فقرے گونجنے لگے "دوسروں کو خوش دیکھ کر کتنی خوشی ہوتی ہے"۔ "نیند بھی کیا فضول چیز ہے"۔ "آپ کے چہروں پر SPIRITUAL LIGHT تھی"

نووارد کچھ نہ بولا۔ بیوی کچھ نہ سمجھی متعجب ہو کر رہ گئی کہ شوہر یہ گنگنا رہا ہے۔

ترسا بچۂ شوخے ، شنگے شکر افشانے

اسے کیا پتہ کہ صنف نازک کی ایک دور مٹھی مغربی کلی اپنی مشرقی بہن کے آڑے آ رہی ہے۔

"فلک پیما"

اگر میں تم سے کہدوں کہ تم مجھے پیاری لگتی ہو تو اے بھورے بالوں والی اے نیلی آنکھوں والی!
خدا جانے تم اِس پر کیا کہو؟

(الیفرڈ ڈمبوسے)

"گ"

غزل

دم اے ملک الموت ذرا بہرِ خدا لے
واپس مرا قاصد درِ جاناں سے تو آلے

حسرت ہے کہ منہ سے کبھی سنوں ناز کی باتیں
اونچی نگاہوں سے مجھے دیکھنے والے

ہو جس کی خلش روح کو سرمایۂ لذت
کیونکر کوئی وہ تیر کلیجے سے نکالے

اے نالۂ دل اُس پہ اثر ہو تو میں جانوں
بے فائدہ یوں عرش ہلانے کو ہلا لے

مٹتے ہیں مٹانے سے کہیں نقش وفا کے
اے حُسن مجھے صفحۂ ہستی سے مٹا لے

نامے پہ لٹائیں گہرِ اشک کی لڑیاں
قاصد کو کیا خوبیٔ قسمت کے حوالے

میں عفو کا طالب ہوں یہ اب تجھ پہ ہی موقوف
ٹھکرا مرا سر یا مجھے سینے سے لگا لے

مشتاق غبارِ سُمِ توسن کی ہیں آنکھیں
اے اسپ نشیں خاک نشینوں کی دعا لے

جو کچھ وہ کہیں گے تجھے معلوم ہے اے صدق
حالِ دلِ بے تاب سنانے کو سنا لے

صدق جائسی

خرابات کی رات

ساقیا ابر اٹھا جھوم کے بھر دے ساغر
مست کر دے کہ ہے مستانہ ادا یہ منظر

ابر بدمست ہے گل وجد میں کلیاں سرشار
چاند پھولوں کا بچھا کُنجِ چمن میں بستر

خمِ ابرو کی طرح خُم کو جھکا دے ساقی
مست آنکھوں کی قسم جھوم کے بھر دے ساغر

بادۂ ناب کے دو گھونٹ پلا دے ساقی
کھول دے مہر و محبت کے دریچے دل پر

محفلِ اہلِ خرابات پہ دم بھر کے لئے
تیرے قربان ذرا مہر و عنایت کی نظر

نرگسی چشم سے کر بارشِ صہبا ساقی
جھومتا ابر چلا آتا ہے مے خانے پر

ذرے ذرے سے اُبلتی ہے جوانی کی اُمنگ
نئے گلرنگ میں ہے عکسِ جمالِ دلبر

کردے اعلان نہ میخانہ کوئی بند کرے
آج ہیں صبح سے وا میکدۂ خلد کے در

ہم جو محرومِ کرم آج رہیں تو کیونکر
بادہ نوشی کا ہے ہر ذرۂ عالم پہ اثر

کوئی کھدو مہ و خورشید کی پروا ہی نہیں
آج رندوں کو ہیں بس جام و سبو شمس و قمر

گونجتی آتی ہے کانوں میں پپیہے کی صدا
سرخیِ بادۂ گلوں ہے سبک پھولوں پر

ایسے لمحوں میں کہ خود دہر ہے اک میخانہ
اُس کی قسمت ہی جسے آج بھی ہو اپنی خبر

نورِ مہتاب میں کلیوں کی ہے خوشبو کا سُرور
ہو گی اب شب نہ میسر کوئی اس سے بڑھکر

جسم کا خون بڑھاتی ہے چمن کی خوشبو
روحِ خوابیدہ جگاتی ہے مئے جاں پرور

جام اک اور دے بیتاب ہے مخمورِ جلال
تیری آنکھوں کی قسم ساقیِ مسکین پرور

جلال

گندم کے پودے کی موت

اکثر ہی دیکھا گیا ہے کہ رعد و برق کے ایک تیز و تند طوفان کے بعد موٹے گندم کا کھیت جھلس زیادہ پڑ جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آگ کی لپٹ اس پر سے گذر گئی ہے۔ دیہاتی تو کہتے ہیں کہ کھیت کی نسل بجلی بگاڑ گئی ہے لیکن میں تمہیں بتاتا ہوں کہ چڑیوں کا اس کے متعلق کیا خیال ہے۔ چڑیوں نے یہ بات ایک بڈھے بید کے درخت سے سنی تھی جو موٹے گندم کے ایک کھیت کے قریب اُگا تھا اور اب تک وہیں ہے۔ یہ بہت بڑا درخت ہے اور اس کی تعظیم کرنا ہر ایک کا فرض ہے۔ اگرچہ عمر کے تقاضے سے اس کے اعضا بیکار ہو چکے ہیں۔ اس کا تنا پھٹ چکا ہے اور اس کے اندر گھاس اور خاردار بوٹیاں اُگ آئی ہیں۔ یہ تھوڑا سا آگے کو جھکا ہوا ہے اور شاخیں لٹک کر زمین تک پہنچی ہیں جو بالکل اس کے سبز سبز بال معلوم ہوتی ہیں۔ آس پاس کے تمام کھیتوں میں غلہ اُگتا ہے صرف بڑی بڑی دلو گندم اور جو ہی نہیں بلکہ جئی بھی ۔ ۔ ۔ خوبصورت جئی جو پک کر یوں معلوم ہوتی ہے جیسے چھوٹی چھوٹی سنہری چڑیوں کا کوئی جھنڈ شاخوں پر بیٹھا ہے۔ غلے کے کھیت عموماً مسکراتے رہتے ہیں۔ بھاری بھاری اور عمدہ بالے پودوں کے سر نیچے جھکا دیتے ہیں اور پودے ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے بہت ہی عاجز اور نیک ہیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ وہاں موٹے گندم کا بھی ایک کھیت تھا۔ یہ کھیت بید کے درخت کے عین بالمقابل اُگا تھا۔ اس کا ایک پودا دوسرے پودوں کی طرح کسی طرح اپنا سر نیچا نہ کرتا تھا اور اکڑ کر نہایت غرور سے کھڑا تھا۔ وہ کہنے لگا میں بھی اتنا ہی معزز ہوں جتنے دوسرے قیمتی پودے اور میں اوروں سے زیادہ خوش رُو ہوں۔ میرے پھول سیب کے پھولوں کی طرح خوشنما ہیں۔ کون ہے جو مجھ سے زیادہ حسین ہو؟ بتاؤ کوئی ہے؟ بتا اے بوڑھے کھوسٹ بید!!

بوڑھے بید نے جواب میں سر کو یوں جنبش دی جیسے وہ کہہ رہا ہے "ہے! ہے! بس ہے!!!"

لیکن موٹے گندم کا یہ نامعقول پودا غرور سے تن کر کھڑا ہو گیا اور پھر آپ ہی آپ بڑبڑا کر کہنے لگا۔ "نامعقول درخت! اتنا بوڑھا ہو گیا ہے کہ اس پر گھاس بھی اُگ آئی ہے"!

اس کے بعد یوں ہوا کہ ایک سخت خوفناک طوفان آیا۔ کھیتوں کے تمام پھولوں نے سہم کر یا تو اپنی پتیاں سمٹا لیں یا اپنے چھوٹے چھوٹے سر نیچے جھکا دیئے۔ طوفان چپکے سے ان پر سے گذر گیا۔ لیکن موٹے گندم کا پودا نخوت سے اکڑا کھڑا رہا۔ پھول بہتیرا سمجھاتے رہے کہ "ہماری طرح سر جھکا لو ہماری طرح سر جھکا لو" مگر اس نے سنی ان سنی ایک کر دی۔

اس کے بعد علسی کی بالوں نے بھی چلا چلا کر اس سے کہا "ہماری طرح سر جھکا لو! جھکا لو! جھکا بھی لو! طوفان کا فرشتہ آرہا ہے۔ اس کے پر آسمان سے زمین تک پھیلے ہیں۔ اس سے پہلے کہ تم رحم کے لیے چیخو وہ تمہیں پٹخ کر زمین پر دے مارے گا"۔

لیکن موٹے گندم کا پودا بڑے اطمینان سے بولا "بھئی مجھے تو جھکنے کی کوئی ضرورت نہیں"۔

اب بوڑھا بید بھی بولا کہنے لگا۔ "اپنے پھول بند کر لو اور سر جھکا لو اور جب بادل پھٹیں تو آسمان میں مت جھانکنا یہ تو آدمی بھی نہیں کر سکتے۔ بجلی کے ایک بار کوندنے سے آسمان کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ دیکھنے کو تو ہم اندر دیکھ سکتے ہیں لیکن یہ نظارہ انسانوں کو بھی اندھا کر دیتا ہے پھر ہماری کیا بساط جو ایسی جرأت کریں ――― ہم جو زمین کی پیداوار ہیں اور ہر بات میں اُن سے کم ہیں"۔

پودا بڑے تمسخر سے کہنے لگا "کم! کم؟ سچ مچ!؟ اچھا اب تو میں آسمان میں ضرور جھانکوں گا"۔

یہ کہکر اس نے نہایت بے باکی سے اوپر دیکھا اور اپنی پُرغرور نگاہیں آسمان پر جمادیں۔ بجلی آسمان کے آرپار نہایت غضب سے بھڑکی۔ اور تمام دنیا کو آگ لگتی ہوئی محسوس ہوئی . . . .

جب یہ دہشتناک طوفان خاموش ہوچکا تو پھولوں اور پودوں نے اپنے جھکے ہوئے سر بارش سے دُھلی ہوئی پاکیزہ اور ساکن ہوا میں اوپر اُٹھا لیے لیکن افسوس بیچارہ موٹے گندم کا پودا ایک بیکار شے کی طرح کھیت میں گر پڑا تھا۔ اس کا جسم بجلی نے جلا کر سیاہ کر ڈالا تھا۔

بوڑھے بید کی شاخیں تیز ہوا میں سرسرانے لگیں اس کے سرسبز پتوں سے پانی کے موٹے موٹے قطرے گرنے لگے۔ یوں معلوم ہُوا جیسے وہ رو رہا ہے۔ چڑیاں اس سے کہنے لگیں "آس پاس کی ہر چیز اتنی مسرور ہے تم کیوں رونے ہو؟ دیکھتے نہیں سورج کس طرح چمک رہا ہے اور بادل نیلے آسمان پر تیر رہے ہیں۔ کیا پھولوں اور جھاڑیوں کی خوشبو تمہیں نہیں آرہی؟ تم کیوں رو رہے ہو؟"

بید نے انہیں دیو گندم کے پودے کی خود پسندی اور غرور کا غمناک قصہ سنایا اور بتایا کہ اسے کس قدر دردانگیز سزا ملی ہے۔ یہ کہانی ایک شام مجھے چڑیوں نے سنائی تھی جب میں نے ان سے کہا تھا کہ "اچھی چڑیو کوئی کہانی تو سناؤ"۔

(اینڈرسن)

مہدی علی خاں

اتنی سی تسلی

میری بتی برابر دونوں طرف سے جل رہی ہے۔
بھلا یہ رات بھر کب روشن رہے گی!
لیکن آہ میرے حریفو اور او میرے دوستو!
کس قدر پُر لطف اور دلکش ہے اس کی روشنی!

غزل

حریمِ شاہدِ معنی میں باریاب نہیں
رہِ طلب میں جو دل خانماں خراب نہیں

تری تلاش میں گم ہو کے پا لیا تجھ کو
حجاب آپ ہی انساں۔ کوئی حجاب نہیں

بہار کیا ہے جو تیرا نہیں تبسمِ ناز۔
خزاں ہے کیا۔ جو ترا شیوۂ عتاب نہیں

ترا فقیر زمانہ ہے، اے ستمِ خوباں!
پیالہ بھیک کا ہے۔ قرصِ آفتاب نہیں

وہ خود ہی پردۂ اوراق میں ہے زمزمہ ساز
کتابِ دل سے مقدس کوئی کتاب نہیں

سکوت خود ہے متکلم۔ سخن شناس تو ہو
نگاہِ پاک تو لا۔ پھر کوئی حجاب نہیں

اگر تو شہرۂ آفاق ہے تغافل میں
مری بلا طلبی کا کہیں جواب نہیں

وظیفۂ عشقِ بتاں کا نہ کر برائے خدا
کتابِ حسن میں اے دل! وفا کا باب نہیں

وہ دل ہے کیفِ مئے زندگی سے نامحرم
جو تلخیِ غمِ دوراں سے بہرہ یاب نہیں

نفس کی شعلہ نوائی پہ رقص کرتے ہیں
جو اہلِ دل ہیں۔ انہیں حاجتِ رباب نہیں

مجھے تو مدِ نظر بیخودی ہے اے ساقی!
ملا لے آنکھوں سے آنکھیں اگر شراب نہیں

فنا ہوئیں جو امیدیں۔ تو کھل گئیں آنکھیں
کہ زندگی سے دل آویز کوئی خواب نہیں

ہمارا غم کدہ زندوں کا ایک مدفن ہے
چراغ شب کو نہیں۔ دن کو آفتاب نہیں

وہی ہے سیلِ حوادث۔ وہی ہے برقِ بلا
غمِ آشناؤں کی دنیا میں انقلاب نہیں

کہیں جنازۂ حسرت۔ کہیں مزارِ امید
کسی دکھی کی ہے دنیا مرا شباب نہیں

امید۔ مرکزِ امید۔ مرقدِ امید
یہ سرگذشت ہی اپنی خیال و خواب نہیں

ترا فسانہ بلا کا ہے خونچکاں نشترؔ
بس اب خدا کے لئے بس کہ دل کو تاب نہیں

نشترؔ جالندھری

سی آر داس کی شاعری

خواب

اُس تاریک وخاموش شب کو مجھے حیرت انگیز طور پر مسحور کن گہری نیند آئی اور میری دونوں آنکھیں بند ہو گئیں۔

اُس وقت اندر باہر ہر چہار طرف تاریکی ہی تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔

یکایک ایک روح پرور خواب میں مجھے ایک انسانی جسم نظر پڑا۔

اُس کا چہرہ ماہ تمثال تھا اور اُس کی آنکھیں مشعل کی طرح روشن تھیں۔

اُس نے کوئی بھی بات مجھ سے نہ کی۔ بےرحم وسنگ دل دیوتا کی طرح خاموش کھڑا رہا۔

بیخوف، خاموش اور دائم ہنس مکھ

میری تمام خوابیدہ خواہشیں یک لخت بیدار ہو گئیں

لیکن آہ وہ چلا گیا اور آسمان پر اپنے کالے کالکوں کی سیاہی چھوڑ گیا۔

اپنے دل رُبا سے

اَے میرے محبوب! ٹھہر جا یہیں رہ اور راحت پذیر ہو میں تجھے شراب محبت پلا پلا کر مخمور بنا دوں گا اور تیری بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں پر بوسے دوں گا۔

اے میرے محبوب! تو سو جا باہر آسمان پر کالے کالے بادل چھائے ہوئے ہیں، برق نہایت تیزی سے چمک رہی ہے۔ رعد زور شور سے گرج رہا ہے اور چاروں طرف تاریکی کی سلطنت چھائی ہے۔ اے مجھ دیوانے کے لعل ایسے وقت میں تو کہاں جانا چاہتا ہے۔

اے میرے محبوب! تو سو جا۔ راحت پذیر ہو۔ میں تجھے شراب محبّت پلا پلا کر مخمور بنا دونگا اور تیری پرکیف اور خوبصورت آنکھوں پر بوسے دوں گا

تیری آنکھوں میں تجسّس ہے تو کس چیز کا طالب ہے؟ زر وجواہر کا۔ یا کسی کی نازبرداری کا یا کسی اور کی محبّت کا۔ اے محبوب یہ سب فانی ہیں۔ ان کی آب وتاب ان کی آرائش وزیبائش۔ ان کی ہستی صرف چندروزہ ہے۔

اے میرے محبوب! سو جا۔ سو جا اے میرے دل وجان کے مالک میں تجھے شراب محبت پلا پلا کر مخمور بناؤنگا اور تیری خوبصورت آنکھوں پر بوسے دوں گا۔

اے میرے پیارے تجھ سے میری طرح کون محبّت کر سکے گا۔ کون تیری نازبرداری کر سکے گا۔ آہ اے میرے خوبصورت پتنگ! تو

اڑنے کے لئے اپنے پروں کو نہ پھیلا۔ کہاں جائے گا تو؟ باہر رعد بھیانک آواز سے گرج رہا ہے اور تاریکی کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے ہاں۔ اے میرے محبوب! تو کہیں بھی مت جا۔ یہیں رہ اور راحت پذیر ہو۔ میں تجھے شرابِ محبت پلا پلا کر مخمور بنا دوں گا اور تیری بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں پر بوسے دونگا۔

آرزو

گو تمہاری ہی باتیں میرے کاشانۂ حیات میں بسنت کے راگ کی طرح گونج رہی ہیں۔
گو تمہارے ہی عشق کی تپش سے میرے دل کا خون پھول بن کر کھلا ہوا ہے
گو یہ بھونرا تمہاری ہی محبت کے نشہ میں سرشار ہو کر تم کو گھیرے ہوئے بھنبھنا رہا ہے۔
اور گو تصور میں بسنت کے پھولوں کی طرح میرے پژمردہ دل کا شگوفہ کھلا ہوا ہے
مگر پھر بھی میری آرزو بہت بے پایاں ہے۔ میں تمہارے تصور کو چھوڑ کر تم کو پانا چاہتا ہوں اور تمہارے لبِ لعلیں پر ایک پرجوش بوسہ دینا چاہتا ہوں۔
تم کہاں ہو؟ آؤ میرے نزدیک آؤ اور میرے سینہ کی خشک زمین پر ایک ہرا بھرا باغ لگا دو

تارے

ان دو منور آنکھوں کے ساتھ اے میرے تارے اے میرے محبوب!
تو دیکھ رہا ہے اوپر کے اُن تاروں کی طرف
اے کاش میں آسمان بن جاؤں
کہ پھر تجھ کو اپنی صد ہزار آنکھوں سے دیکھا کروں

"گلچیں"

افشائے راز

میری زباں نہیں آلودۂ شکایتِ غم — مرے لبوں پہ نہیں شورِ نالۂ ماتم
میں غم نصیب ہوں لیکن خموش رہتا ہوں — میں ہوں تو بحر مگر بے خروش بہتا ہوں
مری جبین ہے آئینہ نوجوانی کا — ہے اس میں عکس ابھی رنگِ شادمانی کا
شریکِ حلقۂ یارانِ میگسار ہوں میں — چمن میں نغمۂ رنگینیٔ بہار ہوں میں
مگر ان آنکھوں کی مشکل کو کیا کروں ہمدم! — کہ اُس کا ذکر چھڑا اور یہ ہوئیں پُرنم
یہ سُرخ سُرخ سے آنسو ٹپک ہی پڑتے ہیں — یہ دل کی آگ سے گویا شرار جھڑتے ہیں
یہ آنکھیں روتی ہیں بے اختیار روتی ہیں — کہاں سنبھلتی ہیں دیوانہ وار روتی ہیں

یہ موتی اشکِ محبت کے رول لیتی ہیں
مگر یہ راز مرے غم کا کھول دیتی ہیں

اثر صہبائی

دو خط

انوار

"تم نہ تو خط لکھتے ہو، نہ یہاں آتے ہو۔ تم نے مجھے بھلا دیا ہو لیکن کیوں؟ میں نے کیا کیا؟ میرے پیارے گلابوں کے مالک بتاؤ میں تم سے کتنی محبت کرتی ہوں۔ اُف کس قدر تمہیں چاہتی ہوں۔ کاش تمہیں معلوم ہوتا! ہمیشہ تم میرے پاس رہتے! مجھے اپنی آغوش میں لئے ہوئے۔ میرا دل اپنے دل سے لگائے ہوئے۔ تمہارے ہونٹ میرے ہونٹوں سے چپٹے ہوئے! ۔۔۔ مجھے تم سے محبت ہے! میرے حسین دیوتا! ۔۔۔ شباب کی تمام امنگوں کے ساتھ! روح کی تمام آرزوؤں کے ساتھ! ہاں مجھے تم سے محبت ہے میں تمہیں چاہتی ہوں"

تمہاری پجارن

صوفیہ

پیر

"میری ننھی صوفیہ

میں جو کچھ کہنے کو ہوں۔ تم ذرا بھی نہ سمجھ سکو گی لیکن کوئی ہرج نہیں اگر یہ خط کسی اور عورت کے ہاتھ میں بھی پڑ جائے تو اُس کیلئے بھی مفید ہو گا۔

اگر تم گونگی بہری ہوتیں تو میں یقیناً تم سے زیادہ عرصہ تک محبت کر سکتا لیکن جو کچھ ہوا اُس کی وجہ یہی ہے کہ تم بول سکتی ہو۔ بس۔

تم جانتی ہو محبت میں خواب بھی نغمہ ہوتے ہیں لیکن اس لئے کہ خواب گیت ہو سکیں ضروری ہے کہ اُن میں مداخلت نہ کی جائے۔ جب بوسوں کے درمیان ہم بولنے لگتے ہیں تو یہ خواب آسمانی خواب جن میں ہماری روحیں پرّاں ہوتی ہیں، ٹوٹ جاتے ہیں! ہاں اگر اس وقت کی گفتگو بھی آسمانی ہو تو اور بات ہے مگر حسین لڑکیوں کے ننھے ننھے لبوں پر آسمانی الفاظ نہیں آتے۔

تم کچھ نہیں سمجھ رہی ہو؟ ہے نا؟ اچھا ہے۔ میں کہے جاؤں گا۔ تم عورتوں میں سب سے زیادہ حسین ہو سب سے زیادہ دلکش، پیار کرنے کے لائق، کیا دنیا میں اور آنکھیں بھی ہیں جن میں تمہاری آنکھوں سے زیادہ خواب ہوں؟ سحر ہو؟ زیادہ نامعلوم خاموش وعدے، محبت کی گہرائی؟ کم از کم میرے خیال میں نہیں۔

اور جب تمہارے پیارے خمیدہ ہونٹوں والے دہانہ پر تبسم رقصاں ہو کر ننھے ننھے دانتوں کو عریاں کر دیتا۔ تو ایسا معلوم ہوتا کہ ان شیریں ہونٹوں سے موسیقی پھوٹ پڑی ہے۔ ایسا نرم، نازک نغمہ ایسا رسیلا کہ جسے سن کر آدمی بے اختیار آہ بھرنے لگے اور اُس وقت، آہ اُس وقت تم بولنے لگتیں تمہاری اُس وقت کی گفتگو مجھے ناقابلِ بیان اذیت پہنچاتی۔ اُس وقت تو میرا جی چاہنے لگتا کہ کاش میں نے تمہیں کبھی نہ دیکھا ہوتا۔

تم ابھی تک کچھ نہیں سمجھ رہی ہو نا؟ میرا ابھی یہی خیال تھا۔ تمہیں یاد ہے جب تم پہلی بار میرے کمرہ میں مجھ سے ملنے آئی تھیں؟ کیسی خوشی سے

افشائے راز

مری زباں نہیں آلودۂ شکایتِ غم　　مرے لبوں پہ نہیں شورِ نالۂ ماتم

میں غم نصیب ہوں لیکن خموش رہتا ہوں　　میں ہوں تو نوحہ گر مگر بے خروش رہتا ہوں

مری جبین ہی آئینہ نوجوانی کا　　ہے اس میں عکس ابھی رنگِ شادمانی کا

شریکِ حلقۂ یارانِ میگسار ہوں میں　　چمن میں نغمۂ نگینی بہا [illegible]

مگر ان آنکھوں کی مشکل کو کیا کروں ہمدم!　　کہ اس کا ذکر چھپا [illegible]

یہ سرخ سرخ سے آنسو ٹپک ہی پڑتے ہیں　　یہ دل کی آگ [illegible]

یہ آنکھیں روتی ہیں بے اختیار روتی ہیں　　کہاں [illegible]

یہ موتی اشکِ محبت کے رول لیتی [illegible]

مگر یہ راز مرے غم کا کھول دیتی ہیں



انوار

تم نہ تو خط لکھتے ہو، نہ یہاں آتے ہو۔ تم نے مجھے بھلا دیا لیکن کیوں؟ میں نے کیا کیا ہے؟ [illegible] کے مالک بتاؤ میں تم سے کتنی محبت کرتی ہوں۔ اُف کس قدر تمہیں چاہتی ہوں۔ کاش تمہیں معلوم ہوتا۔ کاش تم میرے پاس رہتے۔ مجھے اپنی آغوش میں لیے ہوئے۔ میرا دل اپنے [illegible] ہوئے تمہارے ہونٹ میرے ہونٹوں سے چپٹے ہوئے! ــــ مجھے تم سے محبت ہے، میرے حسین دیوتا ــــ شباب کی تمام [illegible] روح کی تمام آرزوؤں کے ساتھ۔ ہاں مجھے تم سے محبت ہے۔ میں تمہیں چاہتی ہوں۔

تمہاری پجارن

[illegible]

[illegible]

[illegible] میرے کمرہ میں مجھ سے ملنے آئی تھیں۔ کیسی خوش تھیں

چمکتی ہوئی تم اندر داخل ہوئی تھیں!...... بنفشہ کی خوشبوئیں جو تمہارے کپڑوں سے چمٹی ہوئی تھیں تم سے پہلے میرے نزدیک آگر مجھے مسحور کرچکی تھیں۔ کیسے ہم لوگ دیر تک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے ایک لفظ کہے بغیر اور پھر لپٹ گئے دو بچوں کی طرح ننھے معصوم بچوں کی طرح۔ پھر اس وقت سے آخر تک ہم ایک لفظ بھی نہ بولے۔"

جدا ہوتے وقت ہمارے کانپتے ہاتھوں نے ہماری آنکھوں نے بہت کچھ کہا تھا اتنا کہ کوئی زبان وہ الفاظ ادا نہیں کرسکتی تم از کم میں نے تو یہی سمجھا اور جاتے جاتے تم سرگوشیوں میں کہتی گئیں "ہم پھر ملیں گے بہت جلد"

"تم نے اتنا ہی کہا تھا لیکن تم نہیں سمجھ سکتیں کہ کتنے خوشگوار دل خوش کن خواب تم نے بیدار کردئے میں نے اپنی تمام آرزوؤں کا اپنی تمام تمناؤں کا عکس تمہاری آنکھوں میں دیکھ لیا تھا"

تم نے دیکھا، میری ننھی صوفی مردوں کے لئے جو عورتوں سے زیادہ سمجھدار ہوتے ہیں محبت کیا ہوتی ہے کتنی جلدی وہ اس سے مغلوب ہوجاتے ہیں ہم عورتیں محبت میں کسی بات کے مضحکہ خیز پہلو کا بھی خیال نہیں کرتیں کبھی یہ نہیں دیکھتیں کہ کونسی بات کس جگہ بے معنی ہے۔

"وہی بات جو ایک شریر چنچل ننھی دوشیزہ کی زبان سے پیاری معلوم ہوتی ہے کیوں ایک موٹی لانبی سنجیدہ عورت کے منہ سے حماقت خیز محسوس ہوتی ہے؟ وہی محبت کے الفاظ جن کی تمنا ہم کسی ایک سے کرتے ہیں کیوں دوسرے کی زبان سے تکلیف دہ معلوم ہوتے ہیں! اس لئے کہ ہر چیز میں اور خاص کر محبت میں ہم آہنگی ہونی چاہئے۔ اس ہستی کے حرکات، آواز، الفاظ اور اظہار محبت میں جو حرکت کرتی ہے بولتی ہے اور پیار کرتی ہے موافقت ہونی ضروری ہے اہم آہنگی عمر میں۔ قد میں۔ بالوں کے رنگ میں حسن میں۔

جب سے تم نے اپنی نوازشیں مجھ پر صرف کرنی شروع کیں سب کچھ ختم ہوگیا بعض اوقات ہم ایک طویل بوسے میں خود کو گم کردیتے، ایسے بوسے میں جب زبانیں بند ہوجاتیں اور دل کی حرکت قریب قریب رک جاتی! ——— اور پھر جب ہمارے لب الگ ہوتے تم زور سے ہنس کر کہہ اٹھتیں "کتنا اچھا بوسہ میری جان"! مجھے ایسا صدمہ پہنچتا کہ جی چاہتا رولوں اتنا کہ تم رونے لگو! چیخنے لگو! آہ میرے فردوسی خواب کو برباد کردینے والی ظالم!

لیکن محبت تو ایک حیوانی جذبہ ہے، سوچنے پر کتنا مضحکہ خیز! آہ میری ننھی صوفیہ کس طاقت نے کس مخفی عجیب طاقت نے تم سے یہ چھوٹا سا محبت کا خط لکھوایا ہے؟

تم نے ہمیشہ اپنی محبت کا اظہار عجیب عجیب لفظوں سے کیا ہے میں نے سب کو ایک جگہ جمع کرلیا ہے لیکن دکھاؤں گا نہیں، تمہاری محبت کے خیال سے۔

"اور بعض اوقات تو تم بالکل بے موقع بول اٹھتیں مثلاً کبھی تو ایسے ایسے موقعوں پر سرگوشی میں کہتیں کہ مجھے تم سے محبت ہے کہ مجھے بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کرنی پڑتی!

سنو بعض بعض حالات میں یہی الفاظ "مجھے تم سے محبت ہے" نہایت بے محل اور مضحکہ خیز ہو جاتے ہیں"

"لیکن تم کچھ نہیں رہی ہو؟ ہاں بہت سی دوسری عورتیں بھی نہیں سمجھیں گی اور مجھے احمق خیال کریں گی لیکن مجھے تو اس کی پروا بھی نہیں!

بھوکے کھانے پر ٹوٹ پڑتے ہیں لیکن مہذب لوگ اسے بدتمیزی خیال کرتے ہیں محبت میں بھی یہی حال ہے۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ عورتیں جو رنگین ساریوں، ریشمی موزوں، غازے سے رنگے ہوئے رخساروں، رنگین ہونٹوں، کھلے بازوؤں اور جسم کو عریاں کر دینے والے لباس کے اثرات سے خوب واقف ہیں کیوں نہیں اس نفرت کو سمجھ سکتیں جو ان کے بے محل احمقانہ جملوں سے ہمارے ——— ہم مردوں کے ——— دل میں پیدا ہو جاتی ہے؟

بعض اوقات بے معنی بے محل مجھے عجیب کام کرتے ہیں ——— لیکن شاذ و نادر!

کوئی بات جو اپنے موقع پر ہوتی ہے کبھی تکلیف نہیں دیتی۔ انسان کو یہ جاننا چاہیئے کہ کس وقت خاموش رہنا مناسب ہے۔

ہاں تو میں تمہیں اپنی آغوشِ محبت میں لیتا ہوں اور تمہارے ہونٹوں کو چومتا ہوں اس شرط پر کہ تم کچھ بولو نہیں!

(ماخوذ) ——— تمنائی بریلی

اگر دنیا کی ساری نعمتیں میرے سامنے پھیلا دی جائیں کہ ان میں سے وہ شے چن لے جو تیری زندگی کو سب سے زیادہ خوش و خرم بنا دے تو میں ایک بچے کو اٹھا کر اپنے گلے سے لگا لوں گا۔

جس کے پاس ایک بچہ ہو وہ اس دنیا میں کبھی تنہا نہیں رہتا

"گ"

بچہ اور سارس

جنگل میں سے گذرتے ہوئے راستے پر چھوٹے چھوٹے دروازوں والی دو دیہاتی جھونپڑیاں کھڑی تھیں ان کی چند کھڑکیاں تو اونچی تھیں اور چند زمین کے ساتھ لگی ہوئی تھیں ان کے ارد گرد شہتوت کے درخت اور خاردار جھاڑیاں دکھائی دیتیں اور دونوں کی چھت پر کائی اور زرد رنگ کے پھول اور گھاس اگی ہوتی کھیتوں میں صرف گوبھی اور آلو نظر آتے۔ باڑ کے قریب بید مجنوں کا بڑا درخت کھڑا تھا، اس کے نیچے ایک لڑکی بیٹھی ایک پرانے شاہ بلوط کے درخت کی طرف جو ان جھونپڑیوں کے عین وسط میں تھا غور سے دیکھ رہی تھی، درخت کا سال خوردہ تنا خشک ہو چکا تھا اور چوٹی پر سے کاٹ ڈالا گیا تھا اس میں ایک سارس نے گھونسلا بنا لیا تھا۔ وہ اس میں کھڑا چونچ۔ رر رہا تھا کہ ایک ننھا سا لڑکا آیا اور لڑکی کے ساتھ کھڑا ہو گیا یہ دونوں بھائی بہن تھے، لڑکے نے کہا تم کس طرف دیکھ رہی ہو؟ لڑکی نے جواب دیا "میں سارس کو دیکھ رہی ہوں ہماری پڑوسن کہتی تھی آج یہ ہمیں ایک ننھا سا لڑکا یا لڑکی لا دے گا۔ آؤ بچے کو آتے دیکھیں"

لڑکا کہنے لگا "سارس کوئی ایسی چیز نہیں لا سکتا پڑوسن نے مجھے بھی یہی کہانی سنائی تھی اور بتاتے وقت ہنس پڑی تھی پھر میں نے اس سے کہا سچ سچ کہو مگر وہ چپ رہی، اس سے میں نے معلوم کر لیا کہ سارس کے متعلق تمام کہانی جھوٹی ہے اور وہ ہمیں بچہ سمجھ کر ہم سے مذاق کر رہی ہے"۔

لڑکی نے پوچھا "مگر بچے آتے کس جگہ سے ہیں"

"ہاں ہاں فرشتہ انہیں اپنے چوغے میں چھپا کر آسمان سے لے آتا ہے مگر اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا اور یہی وجہ ہے کہ ہم معلوم نہیں کر سکتے کہ وہ کب لاتا ہے؟"

اسی وقت بید کے درخت کی ٹہنیوں میں سرسراہٹ پیدا ہوئی بچوں نے اپنے ہاتھ باندھ لئے اور ایک دوسرے کی طرف حیرانی سے دیکھنے لگے "دیکھو یہ کوئی فرشتہ بچے کو لا رہا ہے" معاً ایک جھونپڑی کا دروازہ کھلا پڑوسن باہر نکل کر کہنے لگی "اندر آ جاؤ دونوں اور دیکھو سارس کیا لایا ہے: ——— ایک ننھا سا لڑکا ———

پھر دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر بڑی سنجیدگی سے اپنے سر ہلائے انہیں پہلے ہی سے معلوم ہو چکا تھا کہ بچہ آ گیا ہے۔

(اینڈرسن)

طاہر قریشی

بیوی کا روٹھنا

شریف لوگوں کی طرح میں بھی بیوی کو فرشتہ کہا کرتا تھا۔ اب شادی کے بعد جب مجھے اس پر غصہ آتا ہے تو اسے "گمراہ فرشتہ" کہتا ہوں اور جب زندگی کا افق ابر آلود نہیں ہوتا تو اسے "پر شکستہ فرشتہ" کہنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ پہلی مرتبہ جب میں نے اس شاعرانہ اصطلاح کا استعمال کیا تو فیروزہ نے پوچھا "تم مجھے پر شکستہ کیوں کہتے ہو"۔ میں گھبرا گیا۔ جواب کیا دیتا شادی کو ابھی زیادہ وقت نہ گذرا تھا۔ اس لئے جھوٹ کی عادت نہ پڑی تھی مجھے معلوم نہ تھا کہ ازدواجی زندگی میں غلط بیانی کتنی مفید ہوتی ہے۔ اور اگر حقیقت پر پردہ ڈالا جائے تو عورت کی آنکھیں کس کی آسانی سے چیرہ او دیکھ نہیں ہوتیں۔ میں نے فیروزہ کو ایک مٹھائی کا ٹکڑا پیش کرتے ہوئے طفلانہ سادگی اور جوش سے کہا "فیروزہ! اگر تمہارے پر کٹے ہوئے نہ ہوتے تو مجھے کس طرح یقین ہوتا کہ تم میرے پاس رہ کر مجھے ہمیشہ خوش رکھو گی۔ تم مجھے ہر دم یہ فکر رہتا کہ تم پرواز کر جاؤ گی ... میں اپنے شاعرانہ رنگ میں کہنے ہی کو تھا اور ان نورانی فضاؤں میں پہنچ جاؤ گی جہاں تمہارا آشیانہ ہے"۔ مگر فیروزہ نے مجھے فقرہ ختم نہ کرنے دیا اور بول اٹھی "تمہارا خیال ہے کہ میں تم سے بے وفائی کرتی!" میں نے عذر پیش کرنا چاہا مگر اس نے میرے جواب کی پروا نہ کی۔ منہ بسور لیا اور روٹھ گئی۔ میں نے التجائیں کیں۔ دھمکیاں دیں۔ منت سماجت کی اور پھر ہار کر خاموش ہو گیا۔ میری کسی بات کا اثر نہ ہوا۔ وہ روٹھی ہی رہی۔ میرے چہرے پر محبت۔ نفرت۔ غم۔ غصے اور یاس کے آثار علی الترتیب ظاہر ہوتے مگر وہ چپ سادھے بیٹھی رہی۔ اسوقت مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ روٹھنا کسے کہتے ہیں اور میں آج تک عورت ذات کی اس طاقت سے جسے زیادہ کہتے میں کانوں پر ہاتھ دھرتا ہوں۔ ابھی میری شادی ہوئے ایک مہینہ ہی گذرا تھا کہ میری مسرت کا آفتاب گہنا گیا۔ مکان میں دخل ہو گیا۔ پہلے تو فیروزہ نے روٹھنے کیلئے ایک کرسی مخصوص کر لی پھر ایک گوشہ ڈھونڈا پھر روٹھنے کیلئے ایک کمرے کا انتخاب کیا حتیٰ کہ اب اسے روٹھنے کی اتنی مشق ہو گئی ہے کہ گھر میں جہاں بھی چاہتی ہے روٹھ جاتی ہے۔

میں نے قیاسی اور عملی فلسفے دونوں کا مطالعہ کیا ہے اور منطق، مابعد الطبیعت، حکمت اور نفسیات سے بھی بے بہرہ نہیں لیکن عورت کے روٹھنے کا مسئلہ ایسا عقدہ ہے جسے میں ناخن عقل سے سلجھا نہیں سکا۔ البتہ میں نے اپنے تجربات کی بنا پر بعض اصول وضع کئے ہیں جن سے ممکن ہے کہ دنیا کی موجودہ حالت میں لوگوں کو فائدہ پہنچے۔ اس لئے میں ان کی اشاعت میں بخل کرنا نہیں چاہتا۔

عورت کا روٹھنا بھی ایک بیقاعدہ جنگ کی طرح ہے جس میں مرد کی حیثیت ایک باقاعدہ اور منظم فوج کی ہوتی ہے اور عورت کی حیثیت ایک ایسے پُر فریب دشمن کی جو نہ میدان میں آکر جنگ کا فیصلہ کرتا ہے نہ اطاعت قبول کرتا ہے۔ مرد کی تمام طاقتیں اکٹھی ہو کر بھی عورت کے مقابلے میں کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ توپخانہ مرد کے پاس ہے مگر کس کام کا ہے جب وہ بارود کو مشتعل کرنا چاہتا ہے تو ایک مچھر اس کے ہاتھ کو کاٹ لیتا ہے اور توپ سر کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ پھر مرد لاکھ دلائل سے تیر باری کرے لیکن عورت کے دل پر کوئی اثر نہیں ہوتا کیونکہ اس کی زرہ کو کوئی تیر نہیں چھید سکتا۔ برعکس اس کے عورت کے ہتھیاروں کو دیکھئے ملس

جواب نہیں۔ عورت کی زبان ایک ایسی تلوار ہے جس کی دو دھاریں ہیں۔ ایک دھار طعنہ زنی اور دوسری خاموشی۔ اگر عورت طعنہ زنی پر اتر آئے تو ممکن ہے کہ مرد اسے اپنی حاضر جوابی اور دلائل سے قائل کر لے اگرچہ یہ بھی کچھ کم صبر آزما نہیں لیکن اگر عورت چپ سادھ لے (جسے ہماری اصطلاح میں منہ پھلانا کہتے ہیں) تو کسی تدبیر سے بھی اس کی مہر خاموشی نہیں ٹوٹ سکتی۔ مرد کی تمام کوششیں ناکام ثابت ہوتی ہیں اور اسے بری طرح پسپا ہونا پڑتا ہے۔ اب اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا کہ عورت کی تمام شرائط کے آگے سر تسلیم خم کر کے صلح کرے۔

جب مرد کو غصہ آتا ہے تو کم از کم اس کے ہوش و حواس قائم رہتے ہیں۔ غیظ و غضب کی موجیں اس کے پاؤں کو چھو کر واپس چلی جاتی ہیں لیکن جب عورت کو غصہ آتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ مینہ میں سر سے پاؤں تک بھیگ گئی ہے۔ سکون کی ایک کرن بھی اس کے غضب آلود چہرے کو روشن نہیں کرتی جب فیروزہ سے میری لڑائی ہوتی ہے تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ نصف گھنٹے میں صفائی ہو جائیگی اور ہم پھر مل بیٹھیں گے لیکن وہ دل میں کہتی ہے کہ اب ہم ہمیشہ کے لئے جدا ہو جائیں گے۔ ایسے وقت میں غلط فہمی جلتی پر تیل کا کام کرتی ہے۔ یوں تو میں اسے فیروزہ کہا کرتا ہوں لیکن جب وہ خفا ہو جائے تو پیار سے صرف "زیدا" ہی کہتا ہوں۔ وہ اس سے چڑ کر کہتی ہے "تمہارا خیال ہے کہ جس طرح روزوں سے تمہارا خون خشک ہو جاتا ہے اسی طرح مجھے دیکھکر بھی ہو جاتا ہے مجھے ڈائن سمجھتے ہو نا؟" اسی سے آپ کو اندازہ ہو جائیگا کہ عورت کو بے قاعدہ جنگ میں کتنی مہارت ہوتی ہے۔

میں نے کئی مرتبہ یہ تجویز پیش کی ہے کہ وہ اپنے روٹھنے کا تاوان مجھ سے پیشگی ماہ بماہ وصول کر لیا کرے یعنی میں ایک مہینہ پہلے ہی تسلیم کرنے کو تیار ہوں کہ وہ حق پر ہے۔ لیکن وہ ایسا معاہدہ کرنے پر راضی نہیں ہوتی۔ اس لئے مجھے اندازاً جنتری میں کئی "روٹھنے کے دنوں" کی خانہ پری کرنی پڑتی ہے۔ اور سال کے ختم ہونے پر ان کی تعداد میرے اندازہ سے کچھ زائد ہوتی ہے۔ میری جنتری میں جو عجیب لیکن یاس انگیز بات ہے وہ یہ ہے کہ فیروزہ کے روٹھنے کے متعلق جس دن اور ساعت کا میں اندازہ کرتا ہوں وہ عموماً درست ہوتی ہے۔ لیکن میں اس کے دوبارہ خوش ہو جانے کے دن اور ساعت کی تعیین نہیں کر سکتا۔ وہ کبھی کبھی روٹھ کر خود بخود من بھی جاتی ہے۔ لیکن اس کے منے میں بھی ایک شان ہے۔ مجھے یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ کس بات سے خوش ہوئی ہے۔ اس نے ایک دفعہ مجھے یہ راز بتایا کہ نسوانی فطرت ہی ایسی ہے کہ جب عورت روٹھ جائے تو اسے اس وقت تک چین نہیں آتا جب تک اسے منا نہ لیا جائے اس کا دل ایک گھڑی کی طرح ہے۔ جب وہ خفا ہوتی ہے تو یہ گھڑی بند ہو جاتی ہے۔ وہ اسے دوبارہ چابی دیتی ہے اور اس وقت اسے بجنے دیتی ہے جب اس کی سوئی محبت کی ساعت پر پہنچ جاتی ہے۔ اگر وہ یہ نہ کرے تو دل کی گھڑی بیکار ہو جائے۔

اگر فیروزہ مجھے مسرت کی جنت سے (جو اسی نے میرے لئے بنائی ہے) کبھی کبھی نکال دیا کرتی ہے اور کئی کئی گھنٹے بلکہ کئی کئی دن گزر جانے تک اس میں داخل ہونے نہیں دیتی تو اس میں وہ حق بجانب ہے کیونکہ میرے گھر کی حکومت میں بھی وہی نقص ہے جو ہسپانیہ کی حکومت میں ہے یعنی سب اقتدار صرف ایک قانون ساز ادارے کے اختیار میں ہے اور یہ ادارہ میری بیوی اور مجھ پر مشتمل ہے۔ جب کوئی کشمکش پڑتی ہے تو بدقسمتی سے ہمیشہ جمہور کی فتح ہوتی ہے۔ عورت کا دل ایک مشرقی بازار کی طرح ہے جہاں نیلے آسمان کی چھت کے تلے شاداب پھول اور پھل نظر آتے ہیں۔ حسن، ظرافت، نفاست اور نزاکت کی جنس اس بازار میں بکنے آتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی تلون، احسان فراموشی، کینہ اور بغض کا سودا بھی اس بازار میں کثرت سے ہوتا ہے۔ اگر خانہ داری کے آئین میں ایک کی جگہ دو قانون ساز ادارے ہوں جن میں شوہر بالائی ادارے کی حیثیت رکھتا ہو اور بیوی کی حیثیت تحت الادارہ کی ہو تو اس سلطنت میں امن قائم ہو سکتا ہے اور "جمہور" کو "طبقۂ امرا" پر غالب آنے کا موقع نہیں ملتا۔

عطاء اللہ کلیم



قدیم روس میں ایک دعوت عروسی



ایک ننھا بادشاہ!

"ایک تھا بادشاہ"

بچپن میں ہمیں یہ معلوم کرنے کی ضرورت نہ ہوتی تھی کہ کہانی کا بادشاہ تھا کون؟ خواہ اس کا نام سلاجیت ہو خواہ سیلو اہو، وہ کاشی میں رہتا ہو یا قنوج میں، بات ایک ہی تھی۔ ایک سات سال کے بچے کا دل جس بات پر خوشی سے دھڑکنے لگتا وہ تو یہ عظیم الشان صداقت یہ حقیقت کبری تھی کہ "ایک تھا بادشاہ"۔

لیکن اس نئے زمانے کے پڑھنے والے کہیں زیادہ دقیقہ رس اور محقق واقع ہوئے ہیں۔ جب وہ کسی کہانی کا ایسا آغاز دیکھتے ہیں تو فوراً اُن کی تنقید اور تفتیش کی حس بیدار ہو جاتی ہے۔ وہ قصے کے دھندلکے پر علمی تجسس کی روشنی ڈال کر پوچھتے ہیں: کون سا بادشاہ؟

آج کل کے داستان گو بھی ذرا زیادہ محتاط ہو گئے ہیں۔ اب وہ خود کہانی کے اس پرانے غیر معین آغاز سے مطمئن نہیں ہوتے کہ "ایک تھا بادشاہ"۔ بلکہ اس کے بجائے نہایت عالمانہ بُشرہ بنا کر یوں کہتے ہیں کہ "ایک تھا بادشاہ جس کا نام تھا اجانسترو"

لیکن آج کل کے پڑھنے والوں کے جذبۂ تفحص کی اس پر بھی کہاں تسکین ہوتی ہے۔ وہ اپنی علمی عینک میں سے مصنف پر ایک نظر ڈال کر دریافت کرتے ہیں: کون سا اجانسترو؟

بچپن میں ہم ہر اچھی چیز کا رس پا لیتے تھے اور ایک اپنی ہی بے ربط حکمت سے ہم پریوں کے قصوں میں بھی موہنی کا کھوج لگا لیتے تھے۔ اُن دنوں ہم علم جیسی ناکارہ چیز کی طرف مطلق توجہ نہ کرتے تھے۔ ہمیں صرف حقیقت سے غرض تھی اور ہمارے ننھے منھے بے لوث دل جو ہنوز علمی گورکھ دھندوں میں نہ اُلجھے تھے خوب جانتے تھے کہ حقیقت کا موتی محل کہاں ہے اور ہم وہاں کیونکر پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن آج کل ہم سے یہ توقع رکھی جاتی ہے کہ ہم صفحوں کے صفحے واقعات سے سیاہ کرتے چلے جائیں۔ حالانکہ حقیقت محض اسی قدر ہوتی ہے کہ: "ایک تھا بادشاہ"

مجھے کلکتے کی وہ شام خوب یاد ہے جب یہ کہانی شروع ہوئی۔ دن بھر بارش ہوتی رہی تھی۔ شہر میں ہر طرف پانی ہی پانی نظر آتا تھا۔ خود ہمارے کوچے میں گھٹنوں گھٹنوں پانی چڑھ آیا تھا اور میرے دل کی یہ خفیہ سی امید اب یقین کی حد تک پہنچ چکی تھی کہ میرا استاد آج شام نہ آسکے گا۔ میں برآمدے کے آخری کنارے ایک کرسی پر بیٹھا ہوا کوچے کے

نظارے میں معروف تھا اور میرا مضطرب دل دھک دھک کر رہا تھا۔ میری آنکھیں بارش کے قطروں پر جمی ہوئی تھیں اور جب مینہ ذرا تھمنے لگا تو میں نے بڑے خشوع و خضوع سے دعا کی کہ "یا میرے اللہ مینہ کو ساڑھے سات بجے تک تو برسنے دیجیو!" اس وقت مجھے پورا یقین تھا کہ بارش کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ کلکتے کے کسی گوشے میں ایک شام کسی بے یار و مددگار بچے کو اُس کے استاد کے ہیبتناک پنجے سے بچالے۔

اگر میری دعا کے جواب میں نہیں تو کم از کم قدرت کے کسی زیادہ سخت قانون کے مطابق بارش کا سلسلہ رکا لیکن افسوس کہ یہ بھی میرے استاد کو آنے سے باز نہ رکھ سکا۔

ٹھیک وقت پر مجھے کرچے ہوئے کمرے میں اُس کا چھاتا آگے بڑھتا ہوا نظر پڑا۔ امید کا نصر رفیع دفعتہً دھڑام سے نیچے آرہا اور میرا بے چارہ دل اس کے نیچے کچل کر رہ گیا۔ اگر موت کے بعد پاداش عمل کا کوئی منصفانہ قانون ہے تو یقیناً میرا استاد ایک دوسرے جنم میں میری جگہ لے گا اور میں استاد ہوں گا۔

جونہی مجھے چھاتا دکھائی دیا میں سر پر پاؤں رکھ کر اپنی ماں کے کمرے کی طرف بھاگا۔ میری اماں اور دادی اماں چراغ جلائے آمنے سامنے بیٹھی تاش کھیل رہی تھیں۔ میں دوڑ کر اپنی ماں کے قریب بستر پر جا پڑا اور بولا "اماں استاد آ گیا ہے اور میرے سر میں درد بہت ہے۔ آپ کہیں تو میں آج سبق نہ پڑھوں"۔

مجھے امید ہے یہ کہانی کسی بچے کو نہ پڑھائی جائے گی اور مجھے سچے دل سے یقین ہے کہ یہ نصاب تعلیم میں یا چھوٹی جماعتوں کے طلبہ کی درسی کتابوں میں شامل نہ کی جائے گی کیونکہ جو کچھ میں نے کیا وہ ایک خوفناک جرم تھا اور مجھے اس کے لئے کوئی سزا نہ ملی بلکہ اس کے بجائے میری مجرمانہ درخواست قبول کر لی گئی۔

اماں نے کہا "بہت اچھا" اور پھر ملازمہ سے مخاطب ہو کر کہا "جاؤ استاد سے کہہ دو کہ آج آپ واپس گھر جا سکتے ہیں"۔

یہ صاف ظاہر تھا کہ میری اماں نے میری بیماری کو کوئی اہمیت نہ دی کیونکہ انہوں نے کھیل جاری رکھا اور پھر میری طرف قطعاً التفات نہ ہوئیں ادھر میں تکیے میں سر دے کر دل کھول کر ہنسا۔ میں اور میری اماں ایک دوسرے کو خوب سمجھتے تھے۔

لیکن ہر شخص کو اس بات کا اندازہ ہوگا کہ سات سال کے ایک بچے کے لئے بیماری کے فریب کو دیر تک جاری رکھنا کتنا دشوار ہوتا ہے۔ ایک منٹ بھی نہ گزرا ہوگا کہ میں نے دادی جان کا دامن پکڑ کر کہا "اچھی دادی اماں کوئی کہانی!"

یہ التجا مجھے کتنی ہی مرتبہ دہرانی پڑی۔ دادی جان اور اماں برابر تاش کھیلتی چلی گئیں اور میری بات پر ذرا بھی متوجہ نہ ہوئیں۔

آخر اماں نے کہا "جان نہ کھا بچے۔ ہمیں کھیل ختم کر لینے دے" مگر میں بھی اپنی ہٹ کا پکا تھا۔ یہی رٹ لگائے گیا "دادی اماں کوئی کہانی!" جب اس طرح کام نہ نکلا تو میں نے منہ بسور کر اماں سے کہا "کھیل تو کل بھی ختم ہو سکتا ہے اس وقت مجھے دادی جان سے کوئی کہانی تو سن لینے

دیجئے"

ناچار میری ماں نے تاش کے پتے نیچے پٹخ کر کہا "بہت کھٹ اب مجھ سے بھاگ نہ سنبھلے گا۔ اب اسی کی ضد پوری کیجئے"۔ شاید انہیں خیال آیا ہوگا کہ مجھے تو دوسرے دن کسی تکلیف وہ استاد سے سابقہ نہیں پڑے گا اور اسے پھر وہی بے معنی سبق دہرانے ہوں گے۔

اپنی اماں کی اجازت پاتے ہی میں اچھل کر دادی جان سے لپٹ گیا اور اُن کا ہاتھ پکڑ کر خوشی سے ناچتا ہوا انہیں لپنے بستر پر لگیا پھر میں نے جوشِ مسرت سے تکیہ کو دونوں ہاتھوں میں دبوچ کر پچکنا شروع کیا۔ آخر جب میرے جذبات میں کچھ سکون پیدا ہوا تو میں نے کہا "اچھا دادی جان اب کہانی سنئے"۔

دادی جان نے سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا "اور بادشاہ کی تھی ایک ملکہ"

کہانی کا یہ آغاز مبارک تھا کیونکہ ملکہ صرف ایک ہی تھی۔ عموماً کہانی کے بادشاہ بیویوں کی تعداد کے معاملے میں بہت مُسرف ہوا کرتے ہیں اور جب کبھی ہم یہ سنتے ہیں کہ بادشاہ کی دو رانیاں تھیں تو ہمارا دل بیٹھنے لگتا ہے۔ کیونکہ اُن میں سے ایک نہ ایک پر ضرور کوئی بلا ٹوٹتی ہے۔ لیکن دادی اماں کی کہانی میں اس قسم کا کوئی خطرہ نہ تھا۔ ملکہ صرف ایک تھی۔

اس کے بعد دادی جان نے بتایا کہ بادشاہ کا کوئی بیٹا نہ تھا۔

سات سال کی عمر میں مجھے یہ بات بالکل معمولی معلوم ہوئی۔ کیا ہوا اگر اُس کا بیٹا نہ تھا۔ ممکن ہے بعد میں پیدا ہو جائے۔ یہ بات سن کر بھی میں قطعاً متاثر نہ ہوا کہ بادشاہ بیٹا حاصل کرنے کی آرزو میں تپسیا کرنے کے لئے جنگلوں میں چلا گیا۔ مجھے تو نگل میں جانے پر صرف ایک ہی بات آمادہ کر سکتی تھی اور وہ یہ کہ اس طرح مجھے اپنے استاد کے چنگل سے نجات حاصل ہو جاتی۔

بادشاہ لپنے پیچھے ملکہ کے پاس ایک ننھی سی بیٹی چھوڑ کر گیا۔ جو رفتہ رفتہ بڑی ہو کر ایک خوبصورت شہزادی بن گئی۔

بارہ سال گذر گئے لیکن بادشاہ کی تپسیا ختم نہ ہوئی اور اسے اپنی خوبصورت بیٹی کا کبھی خیال تک نہ آیا۔ اب شہزادی کا باپ اپنی پوری بہار پر آگیا۔ شادی کا وقت بھی گزر گیا لیکن بادشاہ واپس نہ آیا۔ ملکہ گھٹ گھٹ کر مرنے لگی کہ "ہائے میری اندسی بیٹی کی قسمت! یہ عمر بھر کا کنوارپن کیونکر کٹے گا"۔

ایکدن ملکہ نے بادشاہ کے پاس ایلچی بھیجے کہ "اگر زیادہ نہیں تو فقط ایک رات کے لئے واپس آئیے اور ایک وقت کا کھانا ل میں کھائیے"۔ بادشاہ نے یہ بات منظور کر لی۔

ملکہ نے اپنے ہاتھ سے چونسٹھ نفیس کھانے پکائے پھر اُس نے یہ کھانا صندل کے ایک تخت پر سونے کی تشتریوں رچاندی کے پیالوں میں چُنا۔ شہزادی مورچھل ہاتھ میں لئے تخت کے پیچھے کھڑی ہو گئی۔ بادشاہ پورے بارہ سال کے بعد

محل میں داخل ہوا۔ شہزادی مورچھل ہلا رہی تھی اور تمام کمرہ اُس کے حسن سے روشن ہو رہا تھا۔ بادشاہ نے اپنی بیٹی کا دلفریب چہرہ دیکھا تو کھانا بھی بھول گیا۔

آخر ملکہ کی طرف منہ پھیر کر بولا "میں کہتا ہوں یہ لڑکی کون ہے جس کا حسن ایک دیوی کی طلائی مورت کی طرح جگمگ جگمگ کر رہا ہے یہ کس کی بیٹی ہے؟"

ملکہ سر پیٹ کر رہ گئی اور بولی "ہائے میرے نصیب! آپ اپنی بیٹی کو بھی نہیں پہچانتے؟"

بادشاہ کو کچھ دیر کے لئے سناٹا سا گزر گیا۔ پھر بولا "میری ننھی سی بیٹی تو اب عورت بن گئی ہے"۔

ملکہ نے آہ بھر کر کہا "بھلا اور کیا ہوتا۔ آپ کو خیال نہیں بارہ سال گزر چکے ہیں؟"

بادشاہ نے پوچھا "لیکن تم نے اس کی شادی کیوں نہ کر دی"

ملکہ نے جواب دیا "میں آپ کی غیر موجودگی میں کس طرح کوئی مناسب جگہ تلاش کر سکتی تھی؟"

یہ سن کر بادشاہ کے دل میں ایک عجیب جوش بھر گیا اور اُس نے قسم کھائی کہ "کل صبح محل سے نکلتے ہی مجھے جو شخص ملا۔ اسی سے اپنی لڑکی بیاہ دوں گا"۔

شہزادی خاموش کھڑی برابر مورچھل ہلاتی رہی اور بادشاہ نے کھانا ختم کیا"

صبح جب بادشاہ باہر نکلا تو اسے محل کے دروازوں کے سامنے جنگل میں ایک برہمن کا بیٹا ایندھن کے لئے لکڑی جمع کرتا ہوا ملا۔ اس کی عمر سات یا آٹھ سال کی ہوگی۔ بادشاہ نے کہا "میں اس سے اپنی بیٹی کی شادی کروں گا"

بھلا شاہی حکم میں دخل دینے کی کس کو مجال تھی۔ برہمن لڑکا فوراً بلایا گیا اور شہزادی نے اسے اور اُس نے شہزادی کو شادی کی مالا پہنانے کی رسم ادا کی۔

یہ سنتے ہی میں کھسک کر اپنی دلدادی جان کے اور قریب ہوگیا اور بہت بےقراری سے بولا "پھر کیا ہُوا؟"

اُس وقت میرے دل کی گہرائی میں یہ پُرخلوص آرزو چھپی ہوئی تھی کہ کاش وہ لکڑی جمع کرنے والا سات سال کا خوش قسمت لڑکا میں ہی ہوتا۔ رات کی خاموشی میں مینہ کی تڑاتڑ مسلسل گونج رہی تھی میرے بستر کے قریب مٹی کے دیئے کی لو مدھم ہوگئی تھی اور کہانی سناتے سناتے نیند سے دادی اماں کی آواز بھی پڑنے لگی تھی۔ ان سب باتوں نے میرے بھولے بھالے دل کے ایک گوشے کے اندر یہ خیال پیدا کرنے میں مدد دی کہ میں ہی ایک نامعلوم بادشاہ کی سلطنت میں کسی نامعلوم زمانے کی ایک دھندلی صبح کو لکڑیاں چن رہا تھا اور پھر دفعتہً میرے اور اُس شہزادی کے درمیان جو سرستی دیوی کی طرح حسین تھی شادی کی مالاؤں کی بدلی ہوئی۔ وہ ایک عروسِ نو کی طرح از فرق تا بہ قدم طلائی زیور سے لدی ہوئی تھی اور اُس کی زریں پایلوں کی

چھم چھم سے قدم قدم پر راگ پیدا ہوتا تھا۔

اگر میری دادی اماں مصنفہ ہوتیں تو انہیں اس چھوٹی سی کہانی کے لئے بیسیوں قسم کی جواب دہی کرنی پڑتی۔ ہر شخص کا سب سے پہلا سوال تو یہی ہوتا کہ بادشاہ ایک نہ دو اکٹھے بارہ سال تک جنگل میں کیوں رہا اور پھر اس کا مطلب کیا ہے کہ اس طویل عرصے میں اُس کی بیٹی کی شادی ہی نہ ہوئی۔ اس قسم کی تاخیر سراسر ناقابلِ قیاس ہے یہاں تک تو ممکن ہے دادی جان اپنے نقادوں سے نبٹ لیتیں لیکن شادی کے معاملے پر یقیناً ایک الگ طوفان اٹھتا۔ پہلا اعتراض تو یہ ہوتا کہ شادی سرے سے ہوئی ہی نہ تھی۔ دوسرا یہ کہ جنگجو فرقے کے ایک چھتری راجہ اور مذہبی فرقے کے ایک برہمن لڑکے کی شادی ہو ہی کیسے سکتی ہے۔ پڑھنے والے فوراً یہ حکم لگا دیتے کہ مصنفہ نازیبا طور پر درپردہ ہمارے معاشرتی ضابطۂ قوانین کے خلاف ہمیں متاثر کر رہی ہے اور وہ فوراً اخباروں کو اس کے متعلق مراسلے بھیجنے شروع کر دیتے۔

اسی لئے یہ میرے دل کی سچی دعا ہے کہ دوسرے جنم میں میری دادی اماں ایک دادی اماں ہی رہیں اور تقدیر کا کوئی منحوس پھیر انہیں اپنے برگشتہ بخت پوتے کی جون میں نہ لے آئے۔

میں نے جوشِ مسرت سے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ سوال کیا "دادی اماں! دادی اماں! پھر کیا ہوا؟"

دادی جان نے سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا "پھر شہزادی اپنے ننھے شوہر کو لے گئی اور اس کے لئے ایک بہت بڑا ہفت پہلو محل بنا کر اس میں اس کی پرورش کرنے لگی۔

میں خوشی سے بستر پر اچھل پڑا اور تکیہ کو دونوں ہاتھوں کی پہلے سے بھی زیادہ مضبوط گرفت میں لے کر دریافت کیا "اچھا، اچھا پھر کیا ہوا؟"

دادی جان سناتی چلی گئیں:۔ وہ ننھا لڑکا روز مدرسے جاتا اور روز اپنے استادوں سے نئے نئے سبق پڑھتا۔ جب وہ ذرا بڑا ہوا تو اس کے ہم جماعت لڑکے اس سے پوچھنے لگے "ہفت محل میں تمہارے ساتھ وہ خوبصورت عورت کون رہتی ہے؟"

برہمن لڑکا خود یہ جاننے کے لئے بیقرار تھا کہ وہ کون ہے۔ اُسے صرف اتنا یاد تھا کہ ایک دن جب وہ جنگل میں ایندھن اکٹھا کر رہا تھا تو ایک ہل چل سی پڑ گئی تھی۔ لیکن یہ تمام واقعہ اتنا پرانا ہو چکا تھا کہ اب اس کے دل میں اس کی محض ایک دھندلی سی یاد ہی رہ گئی تھی۔

اس طرح چار یا پانچ سال گزر گئے۔ اُس کے ساتھی ہمیشہ اُس سے پوچھتے "ہفت محل میں وہ خوبصورت عورت کون

ہے؟" اور برہمن کا بیٹا مدرسے سے آکر مغموم صورت بنائے شہزادی سے کہتا "میرے ہمجولی ہمیشہ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہفت محل میں یہ خوبصورت عورت کون ہے لیکن میں کچھ جواب نہیں دے سکتا۔ خدا کے لئے مجھے بتاؤ تم کون ہو؟"

شہزادی کہتی "آج کے دن نہ سہی، پھر کسی دن میں تمہیں ضرور بتادوں گی"۔ برہمن کا لڑکا روز یہی سوال کرتا کہ تم کون ہو اور شہزادی روز یہی جواب دیتی کہ آج کے دن نہ سہی، پھر کسی دن میں تمہیں ضرور بتادوں گی۔" چنانچہ اسی طرح اور چار پانچ سال گزر گئے۔

آخر برہمن کا بیٹا صبر کھو بیٹھا اور بولا "خوبصورت خاتون اگر آج بھی تم میرے سوال کا جواب نہ دو گی تو میں ہفت محل چھوڑ کر چلا جاؤں گا"۔ شہزادی نے جواب دیا "اچھا میں کل ضرور تمہیں بتادوں گی"۔ دوسرے دن برہمن کے لڑکے نے مدرسے سے آتے ہی کہا "اب بتاؤ تم کون ہو؟" شہزادی نے جواب دیا "سنو۔ آج رات کھانے کے بعد جب تم سونے لگو گے تو میں تمہیں بتادوں گی"۔

برہمن کا بیٹا رات ہونے تک بے صبری سے انتظار کی گھڑیاں گننے لگا۔ شہزادی نے طلا کار بستر کو سفید چنبیلی کے پھولوں سے آراستہ کیا اور سونے کے دیئے میں خوشبودار تیل ڈال کر اُسے جلایا۔ پھر سر کے بالوں کو گوندھ کر نیلے رنگ کی ایک خوبصورت پوشاک پہنی اور خود بھی رات کے انتظار میں گھڑیاں گننے لگی۔

اُس شام شہزادی کا شوہر برہمن لڑکا بہت بیقرار تھا۔ وہ بمشکل تھوڑا سا کھانا کھا کر سونے کے کمرے میں اپنے زریں بستر پر جو چنبیلی کے سفید سفید پھولوں سے ڈھکا ہوا تھا جا لیٹا۔ لڑکے نے دل میں کہا "آج تو میں ضرور دریافت کر کے رہوں گا کہ ہفت محل میں یہ خوبصورت عورت کون ہے"۔

شہزادی نے اپنے شوہر کا بچا کھچا کھانا کھایا اور پھر چپکے سے سونے کے کمرے میں چلی گئی۔ آج کی رات اُسے ہفت محل کی خوبصورت عورت کا بھید کھولنا تھا۔ لیکن جب وہ اپنے شوہر کے بستر کے قریب گئی تو اسے معلوم ہوا کہ پھولوں میں سے ایک ناگ نکل کر برہمن کو ڈس گیا ہے۔ اس کا شوہر پھولوں کی سیج پر بے حس و حرکت پڑا تھا اور اُس کے چہرے پر موت کی زردی چھا رہی تھی۔

دفعتہً مجھے یوں معلوم ہوا کہ میرے دل کی حرکت بند ہو گئی ہے۔ آنسوؤں سے میری آواز گلوگیر ہو گئی اور میں نے رونی صورت بنا کر پوچھا "پھر کیا ہوا؟"

دادی جان بولیں "پھر . . . ."

لیکن کہانی کی مزید تفصیلات میں جانے سے کیا فائدہ؟ اس طرح بعید از قیاس باتوں کا ایک اور سلسلہ شروع ہو جا—

گا۔ سات سال کا بچہ کیا جانے کہ اگرچہ موت کے بعد بھی "پھر کیا ہوا" کہنے کی گنجائش ہے۔ لیکن اس کا جواب کسی دادی اماں کی دادی اماں بھی نہیں دے سکتی۔ لیکن بچے کا ایمان کبھی متزلزل نہیں ہوتا۔ وہ تو موت کے فرشتے کا دامن بھی پکڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے کہ خبردار! آگے مت بڑھنا۔ پھر یہ بات تو یقیناً بچے کے دل کو غضب میں ڈال دیتی کہ ایک ایسی کہانی جو ایک ایسی شام کو شروع ہوئی جب وہ استاد کی مصیبت سے چھٹکارا پا چکا تھا اس طرح یکدم ختم ہو جائے۔ اس لئے ایک دادی کو ہمیشہ اپنی کہانی انجام کے بند دروازوں سے دور ہی دور رکھنی پڑتی ہے اور اس کا طریقہ بھی بہت سادہ ہے۔ لاش دریا میں کیلے کے تنے پر تیرتی ہوئی بہی چلی جاتی ہے کہ اس پر ایک رحم دل جادوگر کی نظر پڑتی ہے جو زندگی کا منتر پڑھنے لگتا ہے۔ لیکن برکھا رت کی اس رات کو دیئے کی ہلکی ہلکی روشنی میں ننھے لڑکے کے دل سے موت اپنا تمام زور آپ کھو بیٹھتی ہے اور اس کی حقیقت ایک رات بھر کی گہری نیند سے زیادہ نہیں رہتی۔ کہانی ختم ہونے پر تھکی ہوئی آنکھوں کے پپوٹے نیند کے بوجھ سے بند ہونے لگتے ہیں اور یوں ہم ایک ننھے بچے کے جسم کو نیند کی پشت پر لاد کر وقت کے خاموش دریا میں تیرنے کے لئے ڈال دیتے ہیں اور پھر صبح کو کچھ منتر پڑھ کر اسے دوبارہ زندگی اور روشنی کی اس دنیا میں لے آتے ہیں۔

ٹیگور

مترجمہ

حامد علی خاں

بچپن

اُس شخص سے ڈرو جو بچوں کی ہنسی پر ناک بھوں چڑھائے،

میں دنیا میں صرف دو چیزوں سے محبت رکھتا ہوں، خدا اور بچے!

"میرے پیارے بیٹے! جو کام تم آج کر سکو اُسے کبھی کل پر نہ چھوڑو"

"تو امی جان! آؤ نا پھر پکی ہوئی کھیر آج رات ہی کھا لیں!"

"سک ناک"

محفلِ ادب

قطعِ تعلق

اچھا . . . خیر . . . تو خدا حافظ
مگر تو کچھ بھولی تو نہیں جاتی
نہیں تو   اچھا رخصت!
مجھے اب کچھ اور کہنا نہیں ہے ——— اچھا خدا حافظ۔
جاتی ہے؟ اچھا چلی جا
لیکن! ذرا ٹھہر
دیکھ بارش شروع ہوگئی ہے
پانی تھمتے ہی چلی جانا ——— مجھے کچھ اور کہنا نہیں ہے
اچھی طرح بدن چھپالے باہر بڑی تیز سردی ہے۔
اس وقت تو تجھے اوور کوٹ پہننا تھا۔
کیا تیری سب چیزیں تجھے واپس مل چکی ہیں؟
اپنی تصویر اور خط بھی تجھے واپس مل گئے ہیں؟
بہت اچھا ہوا کہ تیری کوئی چیز اب میرے پاس باقی نہیں
اچھا. جا خدا حافظ
لیکن ذرا ٹھہر۔ جدا ہوتی ہے تو ایک ہی دفعہ اور مجھے دیکھ لے
ذرا نگاہیں اٹھادے۔
مگر خبردار نہ میں روؤں نہ تو روئے بیوقوفی ہے
آہ یہ کس قدر تکلیف کی بات ہے کہ ہم اس وقت اپنا پرانا
عشق یاد کرنے کی کوشش کریں۔

آہ میں اپنی زندگی تجھے دے چکا تھا اور تو اپنی زندگی مجھے
دے چکی تھی
ایک دن ایک برس کے لئے نہیں عمر بھر کے لئے ہمیشہ
کے لئے۔
لیکن آج ہم اپنی اپنی زندگی واپس لے رہے ہیں
میں الگ ہو رہا ہوں تو الگ ہو رہی ہے۔
میری بھی نئی زندگی شروع ہوگی اور تیری بھی نئی زندگی
شروع ہوگی۔
آج سے میری راہ الگ بنے گی اور تیری راہ الگ بنے گی
شاید اس جدائی کا مجھے بھی کچھ غم ہوگا اور تجھے بھی کچھ غم ہوگا
پھر اس کے بعد؟
اس کے بعد بھول جانا فراموش کر دینا۔
میں تجھے بھول جاؤں گا۔ تو مجھے بھول جائے گی
پھر اس کے بعد؟
تیری دنیا الگ ہوگی میری دنیا الگ ہوگی۔
آج تک لوگ مجھے اور تجھے ایک ہی سمجھتے تھے ———
کل الگ الگ دیکھیں گے۔
تو میری زندگی کا ایک بھولا بسرا واقعہ بن جائے گی۔
پھر اس کے بعد؟

رستہ میں تو اتفاقیہ کہیں مل جائے گی میں تجھے دیکھ بھی لوں
گا و سلام کلام کچھ نہیں کروں گا اور نہ تو کرے گی۔
تو ایسے کپڑے پہنے نکلے گی جو مجھے پسند نہیں اور میں ایسی
حالت میں ہوں گا کہ تو کراہت کرے گی۔
مہینے گذر جائیں گے اور ہم ایک دوسرے کو نہیں دیکھیں گے
تیرے دوست میرا تذکرہ کریں گے اور تو غور سے سنا
کرے گی اور میں اپنے دوستوں سے تیرے حالات سنا کروں گا
حالانکہ تو میری جان تھی اور میری جان کا اصلی رس۔
میں پوچھوں گا اس چھوکری کا اب کیا حال ہے
دوست جواب دیں گے—— —— خوش ہے
اور میرے دل کا خون ہو جائے گا۔
لیکن خیر یہ بیوقوفی کی بات ہے۔
لیکن ذرا مجھے یہ تو بتا کہ ہم دونوں کے عظیم الشان دل کیا
اتنے ہی حقیر اور چھوٹے تھے جتنے اس وقت معلوم ہو رہے ہیں
کیا ہم شروع سے پاگل تھے؟
کیا تجھے بھی خوش نصیبی کے گذرے ہوئے دن یاد ہیں؟
کیا تجھے یاد ہے جب ہم روز آسمان پر پہنچ جایا کرتے تھے
کیا واقعی ہم عاشق تھے۔
دیکھ ذرا دیکھ تو، کیا یہی ہماری محبت تھی۔
تو مجھ سے کہتی تھی ——— میں تجھے چاہتی ہوں ——
اور میں تجھ سے کہتا تھا ——— میری جان میں تجھ پر دم
دے دوں گا۔
لیکن کیا تیرے اور میرے اس دعوائے محبت کا یہی انجام
ہونا تھا جو آج درپیش ہے
میرے اللہ، آہ، میرے اللہ! یہ انجام کس قدر شرمناک ہے
کیا میں بھی بے وفا ہوں اور کیا تو بھی بے وفا ہے؟
اف تو گیا میں بھی اور تو بھی دونوں سب لوگوں ہی کی
طرح دنیادار ہیں۔
اف اے موت تجھے اب کس بات کا انتظار ہے
لیکن نہیں یہ سب بیوقوفی کی باتیں ہیں۔
تو جا رہی ہے؟
بہت اچھا جا خدا حافظ!
مگر بارش موسلا دھار ہے تو کیسے جائے گی۔
اف ری ضد ان! اس مینہ میں بھی تو نکل جائے گی
تو میں کوئی ہُوّا ہوں
بہت اچھا چلی جا۔ جا خدا حافظ
ارے تو چل پڑی؟
لیکن زنجیر تجھ سے نہیں کھلے گی
رو رہی ہے ——— کیا واقعی تو جا رہی ہے
اس پانی میں بھی جا رہی ہے۔
لیکن نہیں —میں سنگدل سہی— اس پانی میں تجھے جانے
نہیں دوں گا۔ میری جان آہ نہیں۔ میں تجھے جانے نہیں دوں گا۔
یہیں رہ ——— صرف آج کی رات
ملعون ہو جاؤں اگر تجھے ہاتھ بھی لگاؤں
رہ جا میری جان رہ جا۔
لے میرا سر تیرے قدموں پر ہے

تجھے چھوڑ دوں گا؟
ناممکن ـــــ ناممکن ـــــ ناممکن
بیٹھو بھی اب ہم اچھی طرح رہیں گے۔
(پال گرالڈی)

جو کچھ تو کہے گی میں وہی کروں گا
بس غصّہ تھوک دے
آج کے بعد پھر کبھی تجھ سے نہیں لڑوں گا۔
"ہند"

مشرق و مغرب

پوچھا یہ میں نے ایک حکیمِ فرنگ سے ـــ انصاف کا یہ کونسا معیار ہے کہ یوں
مغرب کی پستیوں کو کہا جائے سربلند ـــ مشرق کی رفعتوں کو کہا جائے سرنگوں
مغرب میں حبّ کو جذبۂ ملت قرار دیں! ـــ مشرق میں ہو وہی تو کہیں مذہبی جنوں
مغرب میں ہو قتال تو وہ جہد للبقاء! ـــ مشرق میں ہو جہاد تو بیہودہ کشت و خون
مغرب میں فتنہ گر کو بھی آزادیٔ زباں ـــ مشرق میں راست گوئی بھی اک حرکتِ زبوں
مغرب میں وہم و خبط کی بھی قدردانیاں ـــ مشرق میں علم و فضل کی قسمت بھی واژگوں
مغرب میں داستان بھی تاریخ کا مواد ـــ مشرق میں واقعات بھی افسانہ و فسوں
مغرب میں تو ہوس بھی ہو فطرت کا اقتضا ـــ مشرق میں جوشِ عشق بھی ٹھہرے فسادِ خوں
مغرب میں شغلِ رقص بھی تہذیب کا نشاں ـــ مشرق میں وحشیانہ ہر اک حرکت و سکوں
بولے نہیں یہ مشرق و مغرب کا امتیاز ـــ ہے یہ تو صرف سطوتِ ظاہر کا اک فسوں"

طاقتوروں کی عقل کے معیار میں اسدؔ
کمزور کو کہاں ہے مجالِ چرا و چوں!!

اسدؔ ملتانی

"معارف"

کلوپیٹرا کی ایک رات

کلوپیٹرا چند سہیلیوں کے ساتھ دریائے نیل کے کنارے اپنے قصر میں چپ سادھے بیٹھی ہے۔ انٹنی مصر میں موجود نہیں اس لئے زندگی اس کیلئے وبالِ جان ہو رہی ہے۔ اس وقت اسے یونان اپنا وطن یاد آ رہا ہے اور وہ مصر اور اُس کی ہر چیز سے متنفر ہو رہی ہے۔ کچھ سوچ کر وہ اپنے دل کی بات اپنی سب سے بڑی سہیلی سے یوں کہتی ہے۔

شارمیان اگر میری زندگی میں کوئی دلچسپی ہوتی محبت آہ والہانہ محبت! تو پھر مجھے مصر کا یہ ویرانہ بھی اپنے یونان کی طرح پیارا معلوم ہوتا جس کے علاج

کے بت، پرانی معبد، مصفا چشمے اور پُر فضا گلزار ہر وقت میری نگاہوں میں رہتے ہیں۔ کاش میری زندگی میں کوئی دلچسپی پیدا ہو۔ کوئی جنون خیز واقعہ پیش آئے۔ مگر کون ایک ملکہ سے محبت کرنے کی جرأت کر سکتا ہے۔

کلوپیٹرا انہی خیالات میں غرق ہے کہ ہوا کو چیرتا۔ سائیں سائیں کرتا ہوا ایک تیر کھڑکی کے راستے سے اندر آتا ہے اور زنّاٹے کے ساتھ دیوار کے چوبی حصے میں پیوست ہو کر تھرتھرانے لگتا ہے۔ تیر کے ساتھ ایک رقعہ بندھا ہے جس پر یہ الفاظ لکھے ہیں "مجھے تم سے محبت ہے"۔ یہ وہی چیز ہے جس کے لئے اس وقت کلوپیٹرا کا دل بیقرار ہے۔

تیر انداز جس نے ملکہ کی محبت کے جنون میں جان کی بازی لگائی ہے۔ ایک نوجوان شکاری میامون ہے جس کا مردانہ حسن کسی دیوتا کے تانبے سے ڈھلے ہوئے مجسمے کی یاد دلاتا ہے۔ تیر چلانے کے بعد وہ غائب ہو جاتا ہے لیکن محض اس لئے کہ شاہی حمام میں پانی پہنچانے کی رو بہا میں غوطہ لگا کر باغ میں جا نکلے اور کسی درخت کے پتوں میں چھپ جائے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب کلوپیٹرا جس کے بالوں میں ایک بن دیوی کی طرح کائی کے ریشے اور کنول کے پھول گندھے ہیں تیرنے کے تالاب سے برآمد ہونے لگتی ہے تو دفعتہً اس کی نگاہیں دو آتشیں آنکھوں سے دوچار ہوتی ہیں جو درختوں کے پتوں کے درمیان اس پر ٹکٹکی جمائے ہوئے ہیں۔ کلوپیٹرا کی ہلکی سی چیخ سن کر اس کے غلام جھپٹتے ہوئے آتے ہیں اور اس بے باک نامحرم کو گرفتار کر کے طرفۃ العین میں ملکہ کے قدموں میں لا ڈالتے ہیں۔ کلوپیٹرا کے اس سوال کے جواب میں کہ کیوں نہ تم فوراً قتل کر دیئے جاؤ وہ یہی چند الفاظ گنگناتا ہے "مجھے تم سے محبت ہے"

کلوپیٹرا اسکا بکاسی پہچانتی ہے تیر کے ساتھ رقعہ باندھ کر بھیجنے والا نوجوان یہی ہے۔ وہ دفعتہً اپنے دل میں ایک فیصلہ کرتی ہے۔ نوجوان شکاری رات بھر میرے پاس رہے گا۔ لیکن صبح اسے موت کی گھاٹ اترنا ہوگا

نوجوان جو خوشی سے پھولا نہیں سماتا محل میں پہنچا دیا جاتا ہے جہاں حسبِ معمول ایک عظیم الشان ضیافت کا سامان ہو رہا ہے۔

رات گذر جاتی ہے اور پو پھٹنے کے ساتھ ہی ایک خوفناک گھڑی شکاری کے سر پر آ کھڑی ہوتی ہے۔ ایک غلام اُسے سینگ کا ایک پیالہ پیش کرتا ہے جس میں ابلتا اور پھنکارتا ہوا ایک زہر ہلاہل بھرا ہے۔

کلوپیٹرا کا رنگ اس وقت زرد ہے۔ اُس نے اپنا ایک ہاتھ شکاری کے بازو پر رکھا ہے جس کی جرأت دیکھ کر ملکہ کا جذبۂ رحم برانگیختہ ہو رہا ہے اور وہ یہ کہا ہی چاہتی ہے کہ ابھی زندہ رہو اور مجھ سے محبت کرو کہ ایوان سے باہر نرسنگے کی آواز بلند ہوتی ہے۔ یہ مارک انٹنی کی واپسی کا نغمہ ہے۔ کلوپیٹرا اپنی انگلیاں نوجوان کے بازو سے اٹھا لیتی ہے۔ وہ پیالہ لبوں سے لگا کر غٹاغٹ چڑھا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اُس کی لاش یوں زمین پر گر پڑتی ہے گویا اُس پر بجلی آ پڑی ہے۔

انٹنی نمودار ہوتے ہی کہتا ہے "میری پیاری ملکہ معلوم ہوتا ہے میں وقت گذرنے کے بعد آیا ہوں ضیافت ختم ہو چکی ہے مگر فرش پر یہ لاش کیسی ہے؟"

کلوپیٹرا مسکرا کر جواب دیتی ہے "کچھ نہیں آقا! میں ایک نئے زہر کی آزمائش کر رہی تھی آپ تشریف رکھئے اور ذرا ان یونانی بہروپیوں سے اپنا دل بہلائیے۔"

(حامد علی خاں)

"ادبی دنیا"

مطبوعات

تاریخ ادبیاتِ ایران

پروفیسر ایڈورڈ براؤن مرحوم کی مشہور تصنیف "لٹریری ہسٹری آف پرشیا" کا جو درجہ تنقیدی کتب میں ہے اسے زیرِ بحث نہیں بنایا جا سکتا مشرق و مغرب کے علماء نے علامہ براؤن کی اصابت رائے اور صحیح ذوق کی تعریف کی ہے اور ان کی دیانت داری کی داد دی ہے۔ انھوں نے نہ صرف اہلِ مغرب کی اس غلط فہمی کو دور کیا کہ ایران میں عمر خیام اور حافظ کے سوا کوئی اعلیٰ درجے کا شاعر پیدا ہی نہیں ہوا بلکہ اہلِ مشرق کے دلوں میں ملکم صاحب کی تحریروں سے جو شکوک جاگزین ہو گئے تھے انھیں اپنی بے تعصبانہ روش سے رفع کر دیا۔ فارسی ادب کا وہ قدردان طبقہ جو انگریزی سے ناآشنا ہے پہلے اس قابلِ قدر تصنیف سے فائدہ نہ اٹھا سکتا تھا۔ اب پروفیسر سجاد حسن صاحب عثمانیہ کالج حیدرآباد نے اس کا اردو میں ترجمہ کر کے اس مشکل کو بھی حل کر دیا ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب میں تاریخِ ایران اور فارسی ادبیات پر بیک وقت بحث کی گئی ہے۔ پہلوی۔ زند۔ پازند اور دوسری قدیم زبانوں کا سیر حاصل ذکر کیا گیا ہے۔ اور جدید تحقیق کی روشنی میں ان کی ابتدا اور ارتقا پر رائے زنی کی گئی ہے۔ فارسی نثر پر پہلے بہت کم توجہ دی جاتی تھی اور اس کے متعلق کوئی اچھی تنقیدی کتاب دستیاب نہ ہو سکتی تھی لیکن پروفیسر براؤن کی کتاب نے اس کمی کی تلافی کر دی ہے۔ ہمارے سامنے اس وقت اس کی پہلی جلد ہے جس میں کیانی تاجداروں کی ابتدائے حکومت سے عہدِ بنو امیہ کے خاتمے تک ایران کی مکمل تاریخ شامل ہے اور ایران کی مقدس کتب کے علاوہ تاریخی کتبوں اور دوسرے قدیم شواہد کی ادبی حیثیت اور اہمیت کے بارے میں مصنف نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔

ترجمہ پُرزور، بامحاورہ اور رواں ہے۔ دلچسپ ہونے کے علاوہ سادہ اور عام فہم بھی ہے۔ اگرچہ کہیں کہیں عبارت میں تضاد بھی نظر آتا ہے مثلاً زرتشت کے صحیفہ اوستا کے حال میں لکھا ہے "یہ بغایت دلچسپ کتاب ہے لیکن اس کا مطالعہ ناگوار اور گراں گزرتا ہے"

آگے چل کر لکھا ہے "اوستا کو لسانی یا تقصص یا مقابلے کی ضرورتوں کے علاوہ کسی اور ارادے سے پڑھنا وبھر اور بلائے جان معلوم ہوتا ہے" فنِ تنقید کی متانت "دوبھر اور بلائے جان" جیسے الفاظ کی متحمل نہیں ہو سکتی اور خصوصاً مذہبی کتب کے متعلق ان کا استعمال مناسب نہیں، نہ براؤن صاحب کا یہ مفہوم تھا۔ مگر مصنف اور مترجم کے اختلاف کی ایسی مثالیں بہت کم ہیں اور بحیثیت مجموعی ترجمہ نہ صرف کامیاب بلکہ قابلِ تعریف بھی ہے۔

قدیم ناموں کے بارے میں مترجم نے انگریزی کی تقلید میں "ڈریس" "اسائرس" اور "میڈیائی" کا استعمال کیا ہے اگر ان کی جگہ "داریوش" یا "دارا" "سیروس" اور "مدی" لکھے جاتے تو بہتر ہوتا کیونکہ یہی الفاظ آج کل ایران میں رائج ہیں اور ایران کے ذکر میں ایرانیوں کی تقلید افضل ہے۔ صفحے ۵۶۰ قیمت بلا جلد چار روپے آٹھ آنے۔ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد سے طلب فرمائیے۔

تذکرہ گلزارِ ابراہیم و تذکرہ گلشنِ ہند

علی ابراہیم خاں صاحب خلیل جو وارن ہیسٹنگز کے زمانے میں کمپنی بہادر کی طرف سے بنارس کے گورنر تھے شعرائے ہند کے اولین تذکرہ نویسوں میں سے ہیں اور اپنی غیر جانبداری اور صحیح ذوقِ تنقید کی وجہ سے سب میں ممتاز ہیں۔ انھوں نے بارہ سال کی محنت سے اردو کے شعراء کے حالات مرتب کیے اور ان کے کلام کا انتخاب

بھی کیا۔ یہ تذکرہ اردو زبان کے سرپرست جان گلگرسٹ کو اتنا پسند آیا کہ انھوں نے اس کے اردو میں ترجمہ کیے جانے کا حکم دیا۔ مرزا علی لطف نے حسب الحکم اس کا ترجمہ کیا اور حسب ضرورت اپنی طرف سے اس میں اضافہ بھی کیا۔ مولانا شبلی نے ۱۹۰۶ء میں سے دیگر مؤلفین کی بہت تعریف کی اور از راہِ قدردانی اس کی تصحیح اور تحشیہ کا کام اپنے ذمے لیا۔ مولانا عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی نے اس کا مقدمہ لکھا اور ڈاکٹر محی الدین صاحب ایم۔ اے پی۔ ایچ۔ ڈی نے دیباچہ لکھا۔ اب یہ کتاب ان ہی خوبیوں کے ساتھ دوبارہ چھپی ہے ہماری رائے میں ایسے مکمل اور صحیح تذکرے بہت کم ہیں اور ہر اہلِ ذوق کو اس کی ضرورت ہے۔ صفحے ۲۷۰ قیمت بلا جلد دو روپے مجلد ڈھائی روپے۔

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن سے مل سکتی ہے۔

مجلس

یہ ان مضامین کا انتخاب ہے جو گورنمنٹ کالج لاہور کی مجلس اردو کے جلسوں میں ۳۳-۱۹۳۲ء کے دوران میں پڑھے گئے انھیں دورِ حاضر کے نوجوانوں نے لکھا ہے اور ان مضامین کا تعلق بھی دورِ حاضر سے ہے۔ نو مضامین میں سے چار۔ دورِ جدید کے ان شعراء سے متعلق ہیں جو ابھی زندہ ہیں یعنی اقبال۔ اختر شیرانی جوش ملیح آبادی اور فانی۔ اقبال کی شاعری پر صرف اس نقطۂ نگاہ سے تنقید کی گئی ہے کہ وہ بحیثیتِ فلسفی دنیا کے مستقبل کے متعلق کن خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ اختر شیرانی کی شاعری کے متعلق راشد وحیدی صاحب کا مضمون بہت دلچسپ ہے لیکن ان کے انداز سے ایسی بے تکلفی ظاہر ہوتی ہے جس سے ایک نقاد کو گریز کرنا چاہیئے حضرتِ جوش ملیح آبادی کی شاعری کے متعلق حفیظ صاحب ہوشیارپوری کا مضمون ان کی قوتِ مشاہدہ اور تحسین کا ثبوت دیتا ہے لیکن اگر اس میں ان کی شاعری سے جدید مثالیں بھی شامل کی جاتیں تو بہتر تھا جناب عمر فاروق صاحب کی باقیاتِ فانی پر تنقید ہر لحاظ سے قابلِ قدر ہے۔ باقی پانچ مضامین میں سے دو جرمن ادب اور فلسفہ سے متعلق ہیں اور ان میں گوئٹے اور نٹشے کے پیغامات سے بحث کی گئی ہے، بدقسمتی سے مضمون نگار فلسفہ کے دقیق مسائل کو اچھی طرح واضح نہیں کر سکے اور انھیں دلچسپ بنانے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ ایک اور مضمون میں منشی پریم چند کے افسانوں اور ناولوں پر تنقید کی گئی ہے۔ طرزِ تنقید انگریزی ہے اور عام تنقیدوں سے اس لیے بہتر ہے کہ نہ تقریظ ہے نہ تعریض بلکہ تنقید۔ ان مضامین کے علاوہ ایک افسانہ اور ایک علمی مضمون بھی شامل ہے۔ صفحے ۱۱۲ قیمت ۸/- ملنے کا پتہ :- آغا عبدالحمید معتمد مجلس اردو معرفت دارالاشاعت پنجاب لاہور

سال نامۂ ادبی دنیا

ادبی دنیا" کا سال نامہ اس سال ۲۴۴ صفحات پر غیر معمولی اہتمام سے نکلا ہے، اور اس میں بکثرت بلند پایہ مضامین اور خوبصورت تصاویر نظر آتی ہیں مضامین کا معیار یوں تو بحیثیت مجموعی قابلِ تعریف ہے لیکن یہ مضامین خاص طور پر ہمیں پسند آئے ہیں۔ ڈرامے :- للی کا بیاہ اور آنکھ کا نشہ، افسانے :- وفا کا جال کلوپیٹرا عورت کی طاقت اور بہتون علمی مضامین :- اردو شاعری کا پہلا شاعر، نظموں میں، جوش۔ آزاد سیماب۔ وحشت۔ احسن کا کلام اور متفرقات میں فتوح الشام عورت اور آرٹ وغیرہ ضخامت ۲۵۰ صفحات قیمت ایک روپیہ چار آنے۔ دفتر "ادبی دنیا" لاہور سے طلب کیجئے ٭

ع۔ ا۔ ک

تصاویر

دیہاتی لڑکی خان بہادر عبدالرحمٰن صاحب چغتائی کے آرٹ کا جدید ترین نمونہ ہے حضرت چغتائی کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے زورِ تخیل سے رنگ و خط کی تاثیر کو ایک نیا لباس پہنا دیا ہے انھیں اپنے فن میں ایسی قدرت حاصل ہے کہ وہ تصویروں میں خیالات کا اظہار پوری کامیابی سے کرتے ہیں۔ اس تصویر میں دیہاتی لڑکی اپنی نوجوانی کے خیالات میں گم اپنی راہ کی پروا کئے بغیر اپنی دُھن میں چلی جا رہی ہے۔ درختوں کے جھکے ہوئے سر بھی اس کی حیرانی کی تصدیق کر رہے ہیں۔ گویا مصور نے کائنات کو لڑکی کا ہم نوا بنا لیا ہے تصویر کا ہر خط اور رنگ اس کے جذبات کی ترجمانی کر رہا ہے۔

سوئٹستان کی ایک پہاڑی سڑک سوئٹسٹان یورپ کے وسط میں ایک پُر فضا خطہ ہے جسے بسا اوقات کشمیر سے تشبیہ دی جاتی ہے مغرب کی یہ عشرت گاہ جسے گلزار یورپ بھی کہا جاتا ہے۔ دنیا کی خوشنما ترین سیرگاہوں میں شمار ہوتی ہے۔ یہ سڑک پہاڑ کو کاٹ کر بنائی گئی ہے۔ ایک دَرہ میں سے جھیل کا منظر نظر آ رہا ہے

ٹوٹا ہوا برتن مشہور فرانسیسی مصور گرز کا شاہکار ہے۔ گرز کی تصویروں میں اس کی فطرت کی دردمندی جھلکتی ہے اس تصویر کے مؤثر ہونے کا راز بھی یہی ہے کہ مصور کو اپنی تخلیق سے پوری ہمدردی ہے۔ لڑکی کا بھولا بھالا چہرہ ایسا ہے کہ اسے دیکھتے ہی دل میں رحم کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے اسکے لباس کی بے ترتیبی سے بھی اسکی پریشانی کا اظہار ہوتا ہے

شملے کے دو منظر یہ عکسی تصویریں میاں بشیر احمد صاحب نے شملے کے قیام کے دوران میں موسم گرما میں خود لی تھیں اب انھیں نظم خوبصورتی کے ساتھ شائع ہو رہی ہیں

مغربی ایشیا کی ایک وادی یہ تصویر فریڈرک گوڈل کے موقلم کی آفرینش ہے اور کنعان کا ایک منظر پیش کرتی ہے۔ اس وادی میں چرواہے اور خانہ بدوش آزادانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہی وہ سرزمین ہے جو بنی اسرائیل کے پیغمبروں کا گہوارہ رہی۔

بچپن یہ دو تصویریں بچپن کی معصومانہ مسرت اور جدوجہد کی یاد دلاتی ہیں۔ ایک بچے کے چہرے سے شرارت ٹپک رہی ہے۔ دوسرا پھلوں کی ٹوکری میں ہاتھ ڈال رہا ہے۔ گویا ابھی سے دنیا میں اپنا حق جتانا چاہتا ہے۔

ژان وارک میدانِ جنگ میں سو رہی ہے فرانس کی یہ شیر دل لڑکی سپاہیوں کی طرح رہتی تھی اور ان کی طرح رات کو میدانِ جنگ ہی میں سوتی تھی۔ ایسے موقعوں پر وہ احتیاطاً مردانہ لباس پہنتی تھی مصور نے اسے زرہ میں ملبوس دکھایا ہے۔

خیال جو سنگتراش گستاو میحل کی صنعت کی بہترین یادگار ہے جو لوزم برگ کے نگارخانہ کی زینت ہے "ہمایوں" کی گزشتہ اشاعت میں سوچ بچار کے نام سے جو تصویر چھپی ہے اس سے مقابلہ کرنے پر معلوم ہوگا کہ دونوں فنکاروں کا تخیل انھیں ایک ہی جگہ لے گیا ہے لیکن ان کے تاثرات میں کچھ اختلاف ہے۔

ڈینٹے کا بچپن مشہور اطالوی شاعر ڈینٹے بیٹریس کے ساتھ کھیل رہا ہے۔ اسی وقت اس کے دل میں بیٹریس کی محبت کا پاک جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ جس سے متاثر ہو کر وہ آیندہ بیٹریس کی شان میں ایسی نظمیں لکھتا ہے جن سے وہ زندۂ جاوید ہو جاتی ہے۔

قدیم روس کی دعوتِ عروسی روس میں ایشیائی رسوم بہت حد تک رائج ہیں۔ اکثر اوقات مشرقی ترک و احتشام سے خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ اس تصویر میں بھی کوئی تقریب ہے یا قدیم زمانہ کی عکاسی ہے قیمت نظر آتی ہے

گرمی یہ تصویر آرٹ اکیڈمی کی تفریح گاہ میں ایک یادگار بنی ہوئی ہے گرمی اس میں پورے جوبن پر دکھائی گئی ہے۔ رومانی عورتیں فراغت سے سوفے پر دراز ہیں وہ گرمی سے ایک نشہ سا محسوس کر رہی ہیں جس نے انھیں سست بنا دیا ہے لیکن گرمی ایسی شدید نہیں جس سے وہ گھبرا جائیں۔ وہ صرف انھیں کام سے چھڑا کر فرحت بخشنا چاہتی ہے۔

سرورق بچپن کی ملاقات کے بعد جب ڈینٹے نو سال ہوئے بعد بیٹریس سے ملا تو وہ ایک نوجوان دوشیزہ بن چکی تھی۔ اب اس کے حسن نے ڈینٹے کو کامل طور پر مسحور کر لیا۔ سرورق کی خوبصورت رنگین تصویر اس موقع کی ہے۔